ڈھلان سے ابھرتا سورج
ارمان شمسی
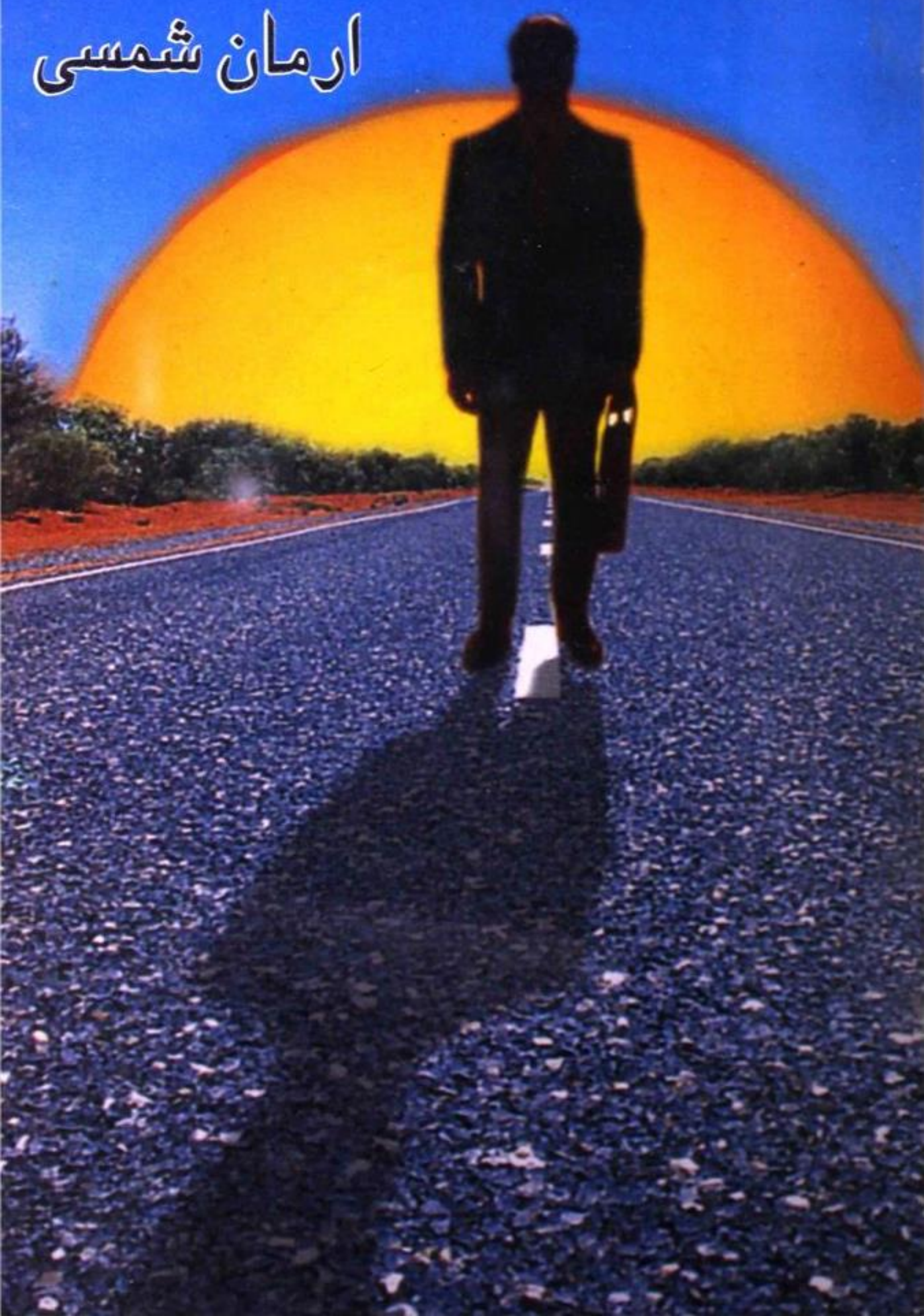
ڈھلان سے اُبھرتا سُورج

(افسانے)

ارمان شمسی

ناشر
بیسویں صدی بک ڈپو۔ آئی۔۳، مُرادی روڈ، بٹلا ہاؤس، جامعہ نگر نئی دہلی۔ ۲۵

نام کتاب: ڈھلان سے ابھرتا سورج
مصنف: ارمان شمسی
سنِ اشاعت: ۲۰۰۶ء
تعدادِ اشاعت: ۵۰۰
قیمت: ۱۷۵ روپے غیر ممالک کے لیے ۱۵ ڈالر
کتابت: شمیم قمر گیاوی
ناشر: بیسویں صدی بک ڈپو۔ آئی-۳۔ مرادی روڈ
بٹلا ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵
مصنف کا پتہ: ۴۸ رفرینڈشپ، ارکیٹ چوک، سرکلر روڈ، ڈھاکہ، بنگلہ دیش
تقسیم کار: بیسویں صدی بک ڈپو۔ آئی-۳، مرادی روڈ
بٹلا ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

انتساب

اپنے مُتبنّے

عمران احمد

کے نام

جو لڑکپن سے ہی امریکہ میں تعلیمی اور نجی اخراجات کی بازیابی کے لیے کشاکش سے

نبرد آزما رہا اور اب میرا نورِ دیدہ

مشی گن یونیورسٹی سے ایم۔ ایس۔ آئی۔ ایس اور ایم۔ بی۔ اے کی ڈگریوں کی ضیاء حاصل کر کے مانندِ آفتاب چمک رہا ہے۔

DHALAAN SE UBHARTA SOORAJ

|

Afsaney

|

Armaan Shamsi

Published by:

BISWIN SADI BOOK DEPOT

I-3, Muradi Road, Batla House

New Delhi-110025

Tel.: 555 94496 Mob : 9871477602

فہرست

حرفِ آغاز	محمد ارمان شمسی	۶
ارمان شمسی کے افسانے	سُلطانہ مہر	۷
۱۔ ایک مُٹھ مائی		۱۱
۲۔ فیٹاسی کنگڈم		۱۹
۳۔ سپنے کا خوف		۲۷
۴۔ ڈھلان سے اُبھرتا سورج		۳۷
۵۔ بقا کی خاطر		۴۵
۶۔ ساوتری		۴۹
۷۔ مُرغ پلاؤ		۵۹
۸۔ ضمیر کا زخم		۶۷
۹۔ روزگار		۷۷
۱۰۔ بھوک کا شکنجہ		۸۹
۱۱۔ جھوٹے سپنے سچے خواب		۹۷
۱۲۔ بھنور		۱۱۱
۱۳۔ پگلی		۱۱۹
۱۴۔ تاریک جھروکے		۱۲۷

حرف آغاز

میرے اس افسانوی مجموعے سے قبل ایک اور مجموعہ "آشنائی کا کرب"
آپ کے ہاتھوں تک پہنچ کر شرفِ قبولیت حاصل کر چکا ہے چوں کہ وہ مجموعہ جنسی مسائل
پر مبنی تھا لہٰذا اس کے بارے میں ملی جلی آرا کا ردِ عمل سامنے آیا۔ کچھ نے ستائشی
نظروں سے دیکھا تو کچھ نے منہ بھی بگاڑا کہ اس موضوع کی ضرورت ہی کیا تھی۔ گو کہ "آشنائی
کا کرب" کے تمام افسانے تلذذ سے پاک تھے۔ ع

یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے (اقبال)

افسانہ نگار مبلغ ہوتا ہے نا اپدیشک وہ تو صرف مسائل کی نشاندہی کرتا ہے، اُن
کے حل کی جانب مبہم اور غیر مبہم اشارے ہی کر سکتا ہے۔ میرے اردگرد بھی بے شمار
مسائل بکھرے رہتے ہیں۔ میں اُن کے دُکھ کو محسوس کرتا ہوں اور دل گداختگی کی بنا پر
تجربے کی عینک استعمال کرتے ہوئے مسائل قلمبند کر دیتا ہوں۔ بقول اقبال ع

شرابِ روح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی

کہانی میں چاشنی کے لیے رنگ آمیزی ضروری ہوتی ہے تاکہ کہانی سپاٹ نہ رہے اور
قاری کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم ہو جائے۔ تھکا ماندہ ذہن لطف و مسرت کی وادیوں
سے گزرتا ہوا لاشعوری طور پر وہ پیغام قبول کرے جو ادیب کا مطمحِ نظر ہوتا ہے اور
شاید یہی کوشش فن کہلاتی ہے۔ میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوں اس کا فیصلہ
آپ کریں گے۔ اس سلسلے میں تمام تشکر و امتنان بہن ڈاکٹر شمع افروز زیدی کے نام جاتا
ہے جنھوں نے میرے شوق کو محسوس کرتے ہوئے میرے فن کو خراد پر چڑھایا اور یوں
میرا نام اُردو کے خادموں کی فہرست میں جگہ پا گیا۔

محبت کا طلب گار ارمان شمسی

ارمان شمسی کے افسانے

انسان کا قصہ گوئی اور حکایت سازی سے ازلی رشتہ ہے۔ یہ خوبی ہی ہے جو ابتدائے آفرینش سے انسانی سرشت میں داخل رہی ہے۔ جب زبان نہ تھی تو لکیروں کے ذریعے انسان اپنی تخیل آفرینی کا اظہار کرتا تھا اور اس کے جذبات ریت اور مٹی پر کھینچی گئی لکیروں کی صورت میں ظاہر ہوتے تھے۔

اور پھر جب انسان کو زبان ملی اور الفاظ کی تخلیق ہوئی تو حکایت سازی اپنے طویل ارتقائی مراحل سے گزر کر مکمل تفسیر حیات اور تشریح کائنات کے مصداق کردار ادا کرنے لگی۔ اب ماں باپ اور نانی دادی سے لے کر کہ جو بچّوں کو رات کو سلاتے وقت کہانیوں کا تانا بانا بُن کر نت نئی کہانیاں تخلیق کرتے رہتے ہیں۔ افسانہ اور کہانی نگار نے چھوٹے سے چھوٹے واقعے کو کہانی کے روپ دینا سیکھ لیا ہے۔ چنانچہ اس فن نے اب اتنی ترقی کی ہے کہ دنیا کی ساری زبانوں نے اس کے لیے اپنا دامن پھیلا کر اسے خود سے جوڑ لیا۔ اب دنیا کی ہر زبان میں شاعری کے ساتھ ساتھ کہانی نویسی نے بھی خوب خوب رنگ جمایا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ نثر کی نسبت شاعری زیادہ مقبول ہے کہ اشعار کے زبان زد عام ہونے میں دیر نہیں لگتی اور ایک شعر بلکہ بعض وقت ایک مصرعہ ہی ایک پوری کہانی کہہ جاتا ہے۔

ڈھاکہ کے ارمان شمسی نے کہانی لکھنے کی ابتدا ۱۹۸۳ء سے کر دی تھی اور ان کا پہلا افسانہ "بھوک کا شکنجہ" دہلی کے ماہنامہ "بیسویں صدی" میں ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔ بیسویں صدی تو خود ایک ادارہ ہے اُس نے اُردو ادب کو کئی نامور افسانہ نگار دیے

"آشنائی کا کرب" ادارہ بیسویں صدی نے شائع کیا ہے۔

بنگلہ دیش کے شہر ڈھاکہ میں مقیم ارمان شمسی کے بقول اب پرانے مشرقی پاکستان اور حالیہ بنگلہ دیش میں اردو اب دھتکاری ہوئی زبان ہے چنانچہ وہاں حالات نے اردو سے محبت کرنے والوں کو ایک اندھی کھائی میں محبوس کر رکھا ہے اور اب اردو کے پرستار غریب الوطن اور غریب الدیار ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کے حوالے سے محبوس الوطن بھی ہو گئے ہیں۔ یہ محاورہ بھی ہمیں ارمان شمسی نے دیا ہے جنھیں اردو کی تازہ تحریر دیکھنے کے لیے مہینوں کی بجائے برسوں کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

ایسے ماحول میں اردو میں کہانیاں لکھنا اور زبان و بیان کی صحت کو نکھارنا سنوارنا آسان نہیں۔ ارمان شمسی کو بھی آسانیاں میسر نہیں اور وہ کٹھنائیوں میں گھرے اردو کے پیار کی جوت اپنے اندر جلائے مسلسل لکھے جا رہے ہیں۔

انھوں نے مجھے اپنے افسانوں کا مجموعہ بھیجا ان کے بقول مجموعہ "آشنائی کا کرب" دوسرا مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ اشاعت کے لیے کسی پبلشر کی مہربانی سے التوا میں پڑا ہے اس مجموعے میں تیرہ افسانے ہیں۔ میں نے افسانہ "بھوٹن" سے مطالعہ شروع کیا اور پھر پڑھتی چلی گئی۔ ہر کہانی اپنی جگہ ایک خوبصورت محاورہ بھی ہے اور ایک دلنشین کہانی بھی۔ "بھوٹن" کا آخری پیرا قاری کو بہت خاموش داد دینے پر مجبور کرتا ہے۔

ایک کہانی "رکھیل" بھی ہانگ کانگ کے خوشنما جادے دکھاتی ہوئی ایک ایسے حیرتناک انجام کی طرف لے جاتی ہے جو آج کے دور میں انسان کا مقدر رکھا ہوا نہیں بنا کر اسے دیا جاتا ہے۔ ایک گرداب ہے ضرورتوں کا۔ بھنور ہے بہتر زندگی گزارنے کی خواہشات کا اور دلدل ہے ان دیکھی انجانی خواہشوں کا۔

ارمان شمسی کی کہانی "بھونچال" بھی ان مجبوریوں کی کہانی سناتی ہے جو ایک گھٹے ہوئے معاشرے کی لڑکیوں کا مقدر بنا دی جاتی ہے۔ یہ کہانی برسوں پہلے عصمت چغتائی نے ہمیں سنائی تھی۔ میری کہانی "آدھی روٹی" بھی اسی موضوع کو چھوتی ہے۔ مگر حالات مختلف ہیں۔ اور ارمان شمسی کا ٹریٹمنٹ بھی۔

ارمان شمسی کی کہانیوں کی اچھی بات یہ ہے کہ گھماؤ پھراؤ اور الجھاؤ نہیں۔ کہانیاں بہت طویل نہیں اور کہانی کہنے کا اسلوب ان کا اتنا پیارا اور سیدھا سادہ ہے کہ کہانی پڑھیں تو لگتا ہے کہانی سن رہے ہیں اور جیسے کردار ہمارے سامنے ہیں۔ ہم بھی انہی کرداروں میں سے ہیں اور جب اختتام تک پہنچتے ہیں تو جیسے اندر سے کوئی کہتا ہے۔ کوئی یا ہم خود کہ کاش ایسا نہ ہوتا مگر جو ہوتا ہے وہ تو بس ہوتا چلا جاتا ہے۔ ناتجربہ کاری اور حالات۔ ''آشنائی کا کرب'' اس کی ایک خوبصورت مثال ہے۔

ڈیڑھ سو صفحے کی اس کتاب کا دیباچہ مشہور افسانہ نگار جناب اظہار اثر نے لکھا ہے اور ناشرہ و مدیرہ بیسویں صدی دہلی ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے مصنف کا تعارف کرایا ہے۔

مصنف نے خود جو لکھا ہے اس میں مختصراً بنگلہ دیش میں اُردو کی بیخ کنی کے بارے میں لکھا ہے اور یہ تھوڑا لکھا بھی خاصا عبرتناک ہے کہ ہم نے واقعی ایسے ''پھل'' بوئے تھے کہ آج ببول کاٹ رہے ہیں؟ کیا جو ہوا اس کا ازالہ ممکن نہیں؟ کیا ہم دونوں ملکوں پاکستان اور بنگلہ دیش میں بھائی چارہ، اخوت اور محبت کی فضا قائم نہیں کر سکتے؟

ہم کر سکتے ہیں۔ حکومتی سطح پر بھی اور معاشرتی سطح پر بھی۔ وفود کا تبادلہ ہو سکتا ہے۔ سمینار کیے جا سکتے ہیں۔ طلبا کا تبادلہ ہو سکتا ہے۔ صرف اُردو زبان کے لیے نہیں بلکہ اس ''بھائی چارہ'' کے لیے بھی جس کی ہمیں ان سے زیادہ ضرورت ہے۔ سو کنواں پیاسے کے پاس نہیں جائے گا پیاسے کو کنویں کے پاس جانا پڑے گا۔

مجھے انتظار ہے کوئی انسان اُٹھے تو اور محبت کا علم لہرائے تو...!

اور اب ارمان شمسی کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''ڈھلان سے اُبھرتا سورج'' بھی ادارہ بیسویں صدی شائع کر رہا ہے۔ اُمید ہے پہلے افسانوی مجموعے کی طرح اس مجموعے کی پذیرائی بھی ادبی حلقوں میں کی جائے گی۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

سلطانہ مہر

۶ ر مارچ ۲۰۰۶ء

"میرا استغراق اس وقت ٹوٹا جب میری سماعت سے لاالٰہ کی عظیم صدا ٹکرائی۔ میں نے اپنا سر اٹھا کر جامع مسجد کے میناروں کو دیکھا۔ یہ سرزمینِ ہند پر پھیلے ہوئے ہزاروں مینار اپنی دلکشی میں بے مثال مساجد، مقابر، قلعے یہ سب کس کا سرمایہ ہیں ہمارا ... ہم سب کا ... مسلمانوں کا ... ہندوؤں کا۔ ہندوستانیوں کا پھر ہم اپنے سرمائے کے دشمن کیوں ہیں؟ بابری مسجد کیوں منہدم کر دی گئی۔ اب متھرا اور کاشی کی مساجد کے انہدام کی باتیں ہو رہی ہیں تو کیا ... تو کیا کل بات تاج محل اور لال قلعے تک بھی پہنچ سکتی ہے ... ہاں ہاں ...! نفرت اور تعصب کے الاؤ میں سب کچھ جل سکتا ہے۔ اپنا گھر بھی بلکہ اپنا وجود بھی"

اسی کتاب سے

ایک مُٹھ ماٹی

پنڈت ہری نندن اُپادھیائے نے اپنی استری کے سورگ باش ہونے کے بعد خود کو سنسار کے جھنجٹوں سے بالکل ہی الگ کرلیا تھا اور اب وہ بھگوان کے چرنوں کے لیے وقف ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ تمام دن کالی مندر کے فرش پر بیٹھے گیان دھیان میں مشغول رہتے یا پھر پوجا کے سمے پوجا کرلیتے اُن کا مندر آس پاس کے علاقے میں سب سے بڑا مندر سمجھا جاتا تھا۔

دیوی کے لیے نذرانے اور چڑھاوے آتے تو وہ کبھی آنکھ اُٹھاکر بھی ان اشیا کو نہیں دیکھتے۔ وہ سب چیزیں دوسرے پنڈت اور خدمت گار آپس میں تقسیم کرلیتے انھیں تو صرف دو وقت کے بھات سے سروکار تھا۔ اب اس دنیا میں ان کا تھا بھی کون ایک بیٹی تھی سو لوگ خود ہی اس کو مقدور بھر بھات اور کپڑے دے دیا کرتے تھے۔ وہ دن بھر مندر میں رہتے اور رات کو بیٹی کی خاطر گھر جاکر سو جاتے۔

دھیرے دھیرے ان کی بے لوثی اور پاک نفسی کا شہرہ دور دور تک پھیلتا گیا۔ اب جہاں کہیں بھی پوجا منڈپ سجتا لوگ پنڈت ہری نند جیسے ارچک[1] کی شرکت کے لیے بیقرار رہتے اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ کلکتے سے بھی ان کے نیوتے آنے لگے۔ وہ کہیں دور دراز جاتے تو اپنی بیٹی ارچنا کو بھی ساتھ لے جاتے ورنہ وہ گھر پر ہی رہتی۔ ان کی بڑی تمنا تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو بھی دھارمک رنگ میں ڈھال دیں اس کے لیے وہ پوری کوشش کر رہے تھے انھیں جب بھی موقع ملتا وہ اسے اُپدیش دیتے رہتے

اور رات کو وہ اس سے نگم سُنتے۔ قدرت نے ارچنا کو صورت شکل کے ساتھ ہی آواز بھی بڑی دلکش دی تھی۔ جب وہ من لگا کر اپنی سُریلی لے میں نگم پڑھتی تو پنڈت ہری نندن جھوم اُٹھتے۔ رات کے سناٹے میں یہ آواز جب باہر جاتی تو پڑوسی بھی آ کر بیٹھ جاتے اور ان کا من شردھا سے بھر جاتا۔

دھیرے دھیرے وقت کے دھارے کے ساتھ بہتے ہوئے ایک دن ارچنا نے جوانی کی دہلیز بھی پار کر لی اس کے چہرے کی معصومیت شباب کی جاذبیت میں تبدیل ہو گئی۔ ہونٹوں پہ گلاب کھل گئے اور گالوں پر ارغوانی رنگ لہریں لینے لگا۔ وہ کاجل لگی بڑی بڑی آنکھوں سے جسے دیکھتی وہ اسے دیکھتا ہی رہ جاتا۔ پنڈت ہری نندن اس سب سے بے خبر بھگوان کی سیوا میں لگے رہے۔ چونکے تو وہ جب، جب اُن کے گاؤں میں شری کنہیّا گوپالن پوجا کا منڈپ استھاپت کیا جانے لگا تو کیرتن سبھا کے لیے ارچنا نے بھی اپنا نام پیش کر دیا۔

اس پوجا کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کرشن مُراری کی مورتی کے سامنے میدان میں گاؤں کی کنیائیں رزمیہ رقص کرتی تھیں۔

تین دن کے میلے کے بعد گاؤں کی سبھا کی جانب سے سب سے اچھی کرتیا کو انعام بھی ملتا۔

ارچنا اس ناچ میں شریک ہونے کی تیاری میں لگی ہوئی تھی کہ گرام کی سبھا نے اس کی زلفوں کی مانگ کر لی۔

یہاں کی پرانی ریت تھی مورتی کے سر کے بالوں کے لیے کسی مگدھا (پاک دوشیزہ) کی زلفیں لگائی جاتی تھیں تو بھلا پنڈت ہری نندن کی پُتری سے زیادہ پاکیزہ اس وقت گاؤں میں اور کون ہو سکتی تھی۔ جب تک وہ جوان نہیں ہوئی تھی تب تک کی اور بات تھی پر اب تو وہ جوان ہو چکی تھی لہٰذا ارچنا کو اپنی زلفیں وارن کرنا پڑیں۔ اس کی زلفیں کتر لی گئیں اور ناچ میں شریک ہونے کی اس کی حسرت ہی رہ گئی۔ یہ اور بات ہے کہ اس سال کا سب سے بڑا اعزاز "مگدھا تلک" اسے ہی پہنایا گیا۔

اسی سال ارچنا نے ہائی اسکول پاس کر لیا اور شہر کے کالج میں داخلے کی فرمائش کی تو پنڈت جی نے پہلے تو مخالفت کی کہ شہر کے ہاسٹل میں رہنا ٹھیک نہیں پھر بات ان کی سمجھ میں آگئی کہ ان کا اکثر گاؤں کے باہر آنا جانا لگا رہتا ہے گھر میں تنہا رہنے سے تو بہتر ہے کہ ارچنا کسی گرلز ہوسٹل میں رہ لے۔

چندر نگر کے رئیس شمبھو ناتھ جی کے یہاں کا نیوتا ان کے لیے آیا ہوا رکھا تھا۔ ان کے یہاں ستو سالہ پوجا کا مہوتسو تھا۔ کئی مہینے پہلے سے ہی وہ اس پوجا کے انتظام میں لگے ہوئے تھے۔ آس پاس کے علاقے میں اس پوجا کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ایسی پوجا میں شرکت مکتی کا کارن سمجھی جاتی ہے جو بڑے بھاگ والوں کو ہی پراپت ہوتی ہے۔ پنڈت ہری نندن بیٹی کو ساتھ لے کر چندر نگر روانہ ہو گئے۔

شمبھو ناتھ نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور پوجا کا کل انتظام انھیں سونپ دیا اس کی نظر میں اس وقت ان سے زیادہ سمت اور ویراگی آس پاس کے علاقے میں دوسرا اور کون تھا جس کو وہ اس مہان پوجا کا انتظام دیتا۔ پنڈت جی نے سب سے پہلے ایک سو ایک وستو کا سوال اٹھایا کہ یہ سب ایک سو ایک چیزیں کھری اور کھالص ہونا چاہئیں تو پوجا سپھل ہوگی۔

شمبھو ناتھ نے جب سب چیزوں کی فہرست دیکھی تو وہ چکرا کر رہ گئے اور ہاتھ جوڑ کر بولے "مہاراج ان سب وستو کا کھالص پراپت کرنا میرے لیے تو ناممکن ہے آپ اس انتظام کو اپنے ہاتھ میں لے لیں کیوں کہ آپ ہی گیاتی ہیں!"

پنڈت جی کسمسائے کہ ان تمام چیزوں کو جمع کرنے میں کئی مہینے لگ جائیں گے۔ میں بھلا اتنے دن تک بھگوان کی شرن چھوڑ کر کیسے رہ سکتا ہوں یہ سنساری کام مجھ سے کیسے ہوگا۔

شمبھو ناتھ پنڈت جی کے چرنوں میں گر گئے "گرو! اگر آپ منع کر دیں گے تو پھر کون اس کام کو کرے گا اور پھر یہ بھی تو بھگوان کا ہی کام ہے۔"

پنڈت ہری نندن خاموش رہے۔ ارچنا کو وہ کلکتہ لے جا کر گرودیو کالج میں

داخل کر آئے۔

پھر دھیرے دھیرے تمام چیزیں جمع ہوتی چلی گئیں اب صرف تین چیزیں باقی رہ گئی تھیں۔ سورج کی پہلی کرن لگا بہتی ندی کا اکیس دن تک کا جمع کیا ہوا جل، اکیس قسم کے بن میں کھلے سفید اکیس پھول اور ویشیا کے پاؤں تلے کی مٹی۔

شمبھوناتھ جی نے چار آدمیوں کی ٹولی پنڈت جی کے ساتھ کر دی جو سندر بن کے لیے روانہ ہو گئی تاکہ وہ اکیس دن تک ندی کا پانی اور سفید جنگلی پھول حاصل کر سکے۔

بن سے واپس آتے آتے پارٹی کو کافی دن لگ گئے۔ ندی کا جل اور پھول تو حاصل ہو گئے تھے اب صرف ویشیا کے پاؤں تلے کی مٹی رہ گئی تھی۔

اس عرصہ میں پنڈت جی بیمار ہو کر کمزور ہو گئے تھے۔ انھیں ارچنا کی یاد ستا رہی تھی۔ وہ شمبھوناتھ سے رخصت لے کر کلکتہ روانہ ہو گئے۔

کلکتہ پہنچ کر انھیں سخت مایوسی ہوئی۔ ارچنا ہاسٹل میں نہیں ملی کیوں کہ پوجا کی چھٹی کے لیے ہاسٹل بند ہو چکا تھا اور وہ واپس گاؤں جا چکی تھی۔

انھوں نے سوچا پہلے کام ختم کر لوں تو پھر ارچنا سے ملنے گاؤں جاؤں لہٰذا انھوں نے ویشیاؤں کے اڈے کا پتہ معلوم کیا اور شیام بازار روانہ ہو گئے۔

سوناگاچھی کی گلی میں داخل ہو کر وہ کانپ کر رہ گئے۔ بے شمار نگاہیں انھیں حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ کچھ طوائفیں اپنے کوٹھوں کے برآمدوں میں بیٹھی سر کی جوئیں نکال رہی تھیں، تو کچھ آپس میں گپیں کر رہی تھیں۔ کوئی کوٹھے کے جنگلے پر ہاتھ ٹیکے سگریٹ پھونک رہی تھی۔ سامنے پانی کا نل تھا جہاں ایک لڑکی اپنی دھوتی دھو رہی تھی اور دو لڑکیاں نہا رہی تھیں۔

اچانک ان کی نگاہ سامنے پان کی دکان پر گئی جہاں دو خوبصورت لڑکیاں کھڑی ہوئی پان خرید رہی تھیں۔

اپنے چہرے بشرے سے وہ انھیں ویشیائیں ہی معلوم ہوئیں اور جب وہ پان لے کر واپس جانے لگیں تو پنڈت جی بھی ان کے پیچھے لپکے۔

لیکن یہ تو انھوں نے سوچا ہی نہیں تھا وہ ولیشیائیں پکی سڑک پر چل رہی تھیں اس سڑک سے مٹھی بھر مٹی تو کیا چٹکی بھر خاک بھی لینا مشکل تھی۔ وہ ان کے پاؤں کو حسرت سے دیکھنے لگے تو وہ دونوں نوجوان چھوکریاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور بولیں "رات کو آنا چاہیے پاؤں چومنا چاہے منہ۔"

پنڈت جی شرم سے پانی پانی ہو گئے۔ انھوں نے گھبرا کر اپنی نگاہیں نیچی کر لیں ابھی وہ واپسی کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ انھیں اپنے کاندھے پر ایک بھاری ہاتھ کا احساس ہوا۔ انھوں نے گھوم کر پیچھے دیکھا تو ایک بڑی سی مونچھ والا پہلوان نما شخص اُن سے مخاطب تھا "دن میں بھی انتجام ہو جائے گا آؤ میرے ساتھ چلو۔"

پنڈت جی ہکا بکا اس کی صورت تکنے لگے۔ تو وہ پہلوان پھر بولا "ہریان کیوں ہوتے ہو اس سے اچھی چھوکریا دلاؤں گا گولی ہے بالکل گولی۔ بالکل گولی۔" کہتے ہوئے اس نے پنڈت جی کے چہرے کے سامنے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو خم دے کر پہنچے کو گول گول دو تین بار اس طرح گھمایا گویا گیند دکھلا رہا ہو۔

پھر اس نے اپنی بائیں آنکھ دبا کر ان کے شانے پر ایک دھول جھاڑی اور بولا۔ "تمھاری کمریا نہ بول جائے تو کہیو۔"

پنڈت جی کے اوسان خطا ہو گئے۔ ان کے پاؤں لرزنے لگے۔ خوف اور گھبراہٹ نے ان کی زبان گنگ کر دی۔ انھوں نے اپنے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پہ زبان پھیری۔ پھر اُن کے منہ سے ایک مری ہوئی سی آواز نکلی جیسے کنویں میں سے بول رہے ہوں۔ "میں اس لیے یہاں نہیں آیا ہوں۔"

"تو بھیّا کاہے آئے ہو کوئی سی آئی ڈی ہو کا؟"

پنڈت جی نے گھبرا کر اپنے سر کو نفی میں دو تین بار جنبش دی اور بدقت بولے "میں تو مٹی لینے آیا ہوں۔"

"مٹی.....؟" اس شخص نے انھیں حیرت سے دیکھا اور بولا "مٹی کیسی؟ مٹی تمھیں کسی کھیت یا جنگل میں ملے گی یہاں کہاں کھوج رہے ہو؟"

اتنے میں پنڈت جی کے حواس قابو میں آ چکے تھے۔ انھوں نے ہمت کی اور بولے۔
''دراصل مجھے پوجا کے لیے ویشیا کے پاؤں کے نیچے کی مٹی درکار ہے۔''
''کیا.....؟'' اس نے اپنے بڑے بڑے دیدے نکالے اور بولا ''پوری جندگی ہوگئی ہم نے یہ انوکھی بات تو کبھی نہیں سُنی یہ کیسی پوجا ہے؟''
''یہ ایک خاص پوجا ہے۔''
''کوئی جادو وادو کا چکر ہے کیا؟'' یہ بات اُس نے کسی قدر زور سے کہی تو پاس سے گذرتی ہوئی دو ایک طوائفوں نے بھی سُن لی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں اچھا خاصہ مجمع لگ گیا۔ پنڈت جی تماشہ بن گئے چھوکریوں نے ان سے ٹھٹھول شروع کردی تب ہی ایک بوڑھی نائکہ تیوریاں چڑھا کر سامنے آئی اور پنڈت جی کو دھکا دیتی ہوئی بولی ''ہماری چھوکریاں جادو ٹونے کے کام نہیں کرتیں وہ تو من بہلاتی ہیں من سمجھے۔ اب تم یہاں سے بھاگ جاؤ ورنہ وہ مار پڑے گی کہ جیون بھر یاد کروگے۔''
پنڈت جی اور بھی حواس باختہ ہوگئے انھوں نے وہاں سے بھاگ جانے میں ہی عافیت سمجھی۔
وہ منہ لٹکائے مغموم اور پریشان ٹرام اسٹینڈ کی جانب چلے جارہے تھے۔ دماغ میں سخت ہیجان بپا تھا۔ زندگی میں آج تک کبھی ایسے اپمان کے بارے میں انھوں نے سوچا بھی نہ تھا۔ جیون بھر لوگ انھیں آدر ہی دیتے آئے تھے۔ اُن کا من رونے دے رہا تھا۔ اچانک ان کا سر چکرایا اور وہ گرتے گرتے بچے تب ہی انھیں احساس ہوا کہ وہ بہت تھک گئے ہیں۔ کئی مہینے سے برابر دوڑ دھوپ کر رہے ہیں کچھ دن گھر جاکر آرام کرنا چاہیے۔ گھر کا خیال آتے ہی انھیں ارچنا کی یاد آئی اور وہ بے کل ہوگئے۔ پھر بے اختیاری طور پران کا رُخ بس اسٹینڈ کی جانب ہوگیا جہاں سے وہ اپنے گاؤں شرن پور کی بس پکڑ سکتے تھے۔
جب بس شرن پور پہنچی تو رات ہو چکی تھی۔ کھمبوں پر دور دور سے پیلے پیلے بلب ٹمٹما رہے تھے۔ آکاش میگھ سے بھرا ہوا تھا۔ ہوا ٹھنڈی چل رہی تھی۔ پھر ہلکی ہلکی ٹپاٹپ

شروع ہوگئی۔ سوکھے کھیتوں سے اُٹھتی ہوئی مٹّی کی باس کو محسوس کرکے انھیں فرحت کا احساس ہوا۔ انھوں نے مٹمیلے اندھیرے میں زور سے اپنی کُٹیا کے ہیولے کو دیکھا اور اپنے قدم تیز کر دیے۔

جب وہ اپنے مکان کے نزدیک پہنچے تو میدان میں کھڑی ایک چمکتی ہوئی کار کو دیکھ کر متعجب ہوئے اور بڑبڑائے یہاں شہر سے کون آیا ہے۔ پھر انھوں نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی کوئی بھی متنفس انھیں نظر نہ آیا۔ کچھ دور داہنی جانب مودی کاکا کی دکان پر بتّی جل رہی تھی وہ لپک کر مودی کاکا کی دکان کی جانب بڑھے۔

کاکا نے انھیں دیکھتے ہی پرنام کیا۔ خیر خبر پوچھنے کے بعد انھوں نے کاکا سے سوال کیا "یہ کار کس کی ہے؟"

"آپ کے ہی مہمان ہیں شہر سے اکثر آتے رہتے ہیں" کاکا نے کچھ عجیب سے چبھتے ہوئے لہجے میں جواب دیا جیسے اُلٹا انھیں سے سوال کر رہا ہو، کیا آپ اپنے مہمانوں کو نہیں پہچانتے؟"

"پر میرے گھر کون مہمان آیا ہے؟" وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنے گھر کی جانب بڑھے۔

دروازے پر لٹکتا پردہ ہٹا کر وہ اندر داخل ہوئے صحن میں اندھیرا چھایا ہوا تھا "ارچنا... ارچنا بیٹی....؟"

وہ آوازیں دیتے ہوئے آنگن کو پار کرکے اپنی کوٹھڑی تک پہنچے وہاں تالا پڑا ہوا تھا۔ اب وہ ارچنا کی کوٹھڑی کی جانب بڑھے۔

"ارچنا؟" انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا

"کون ہے؟" اندر سے ارچنا کی آواز آئی۔

"میں ہوں تمھارا بابا!"

پنڈت جی کے جواب پر ایک لمحے کے لیے سنّاٹا چھا گیا۔ پھر کچھ تیز قسم کی سرسراہٹیں سُنائی دیں اُسی کے ساتھ ہی کھسر پھسر کی آوازیں بھی۔ اور جب کچھ دیر بعد دروازہ

کھلا تو...... دیئے کی مدھم روشنی میں وہ اس کا چہرہ بھی صاف طور سے نہیں دیکھ سکے
پھر ایک کار اسٹارٹ ہوکر روانہ ہوگئی۔
اندر جاکر کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے انھوں نے بیٹی سے سوال کیا "ارچنا.........
کون تھا......؟"
"مہرا بندھو" ارچنا نے سر جھکا کر آہستہ سے جواب دیا۔
اُس سے زیادہ اور کچھ اُن سے پوچھا نہ گیا۔ انھوں نے ارچنا کو پھولوں کی طرح
پالا تھا۔ زندگی میں کبھی اُسے سخت سُست نہ کہا تھا۔ اُن کا دل ڈوبنے لگا وہ نڈھال
ہوکر وہیں کھاٹ پر لیٹ گئے۔
ارچنا نے کھانے کو پوچھا تو انھوں نے منع کر دیا نہیں میری طبیعت ٹھیک
نہیں ہے۔
رات بھر وہ کھانستے رہے اور انگاروں پر لوٹتے رہے۔ ارچنا بار بار اُٹھ کر آتی
بابا کیا طبیعت زیادہ خراب ہے۔ ماتھا دبا دوں؟
"نہیں بیٹی، تو جاکر سو جا۔"
ارچنا کو بھی رات بھر نیند نہیں آئی بھور ہوئی تو اسے کھٹکے کا احساس ہوا وہ اُٹھی اور
آہستہ چلتی ہوئی دروازے کے پاس آئی تو دیکھا پنڈت جی چوکھٹ کے پاس بیٹھے ہوئے
زمین کھود رہے ہیں۔
"بابا کیا کر رہے ہو؟" ارچنا نے پوچھا۔
"کچھ نہیں بیٹی ایک مُٹھ ماٹی لے رہا ہوں۔"

۱؎ عابد ۲؎ رقص ۳؎ رقاصہ ۴؎ نذر ۵؎ پاک دوشیزہ

فینٹاسی کنگڈم

گھر کے سب بچے فینٹاسی کنگڈم کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ پنٹو جو ان میں سب سے سینئر تھا آنکھیں نکال کر بولا ''معلوم بھی ہے یہ پارک ششو پارک سے بھی زیادہ بڑا ہے اور یہاں پر ایسے ایسے جھولے ہیں جو دنیا میں کہیں بھی نہیں ہیں صرف جاپان میں ہیں۔''

روبی جواب میں منہ بنا کر بولی ''اب ایسا بھی نہیں ہو گا۔ آخر دنیا میں امریکہ اور انگلینڈ بھی تو ہیں یا پھر جاپان اور بنگلہ دیش ہی ہیں۔ جن کے جھولے سب سے اچھے ہیں؟''

اپنی بات کو خراب ہوتے دیکھ کر پنٹو نے جلدی سے وضاحت کی ''سچ، میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ ایک جھولا تو اتنا اوپر جاتا ہے کہ ڈر کے مارے سب چیخنے لگتے ہیں اور پھر تیزی سے جب واپس آتا ہے تو سب کے دم نکل جاتے ہیں۔''

گھر کا ملازم لڑکا، منان بھی ان کے نزدیک کھڑا باتیں سن رہا تھا۔ پنٹو کی بات سن کر اس نے مداخلت کی تو پھر ایسے جھولے میں چڑھنے کی کیا ضرورت ہے جس میں بیٹھ کر دم نکلنے لگے۔

منان کی بات سن کر سب بچے مسکرا دیے ''ابے گدھے، مزہ جو آتا ہے، ورنہ کیا مرنے کے لیے کوئی وہاں جائے گا۔''

بے بی نے منہ چڑایا ''اوں..... اوں بات کو سمجھتا نہیں گدھا اور بیچ میں ٹانگ اڑاتا ہے۔''

پپّو نے ہاتھ بڑھا کر متان کو دھکا دیا "تو ہٹ یہاں سے، تیری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آئیں گی۔ تو نے تو شِشُو پارک بھی کہاں دیکھا ہے جو فینٹاسی کنگڈم کے معاملے میں اپنی ٹانگ اڑا رہا ہے۔ سب بچے ہنسنے لگے تو پپّو نے اپنی بات آگے بڑھائی اور چٹخارے لے کر بولا "ایک ریل گاڑی بھی ہے جو سچ مچ کی ٹرین کی طرح دوڑتی ہے اور گھاس پھونس سے بھرے میدان سے گذرتی ہوئی ندی کے پُل پر چڑھ جاتی ہے پھر وہاں سے ایک جھٹکے سے نیچے گرتے ہوئے پہاڑوں کی گپھاؤں میں داخل ہو جاتی ہے۔ گپھا کے اندر ہلکا ہلکا اندھیرا ہوتا ہے جہاں پتھروں کے پیچھے سے بڑے بڑے سینگوں والے دیو اور کالے کالے بھوت اور چڑیلیں شور مچاتی ہوئی باہر نکل آتی ہیں اور ہاتھ بڑھا بڑھا کر بچّوں کو پکڑنے کی کوشش کرتی ہیں۔"

یہ سُن کر بے بی کا چہرہ فق ہو گیا "نا بھیا! میں نہیں جاؤں گی۔ اگر کسی بھوت چڑیل نے مجھے پکڑ لیا تو کیا ہوگا؟"

"ارے پگلی یہ سب سچ مچ کا تھوڑی ہوتا ہے۔ بس ہنسی مذاق ہے۔"

متان کا جی چاہا کہ وہ اُن کو بتلائے بھوت چڑیل مذاق نہیں کیا کرتے، وہ تو سچ مچ بچّوں کو کچا چبا جاتے ہیں۔ لیکن وہ بولا نہیں۔ بے بسی سے تھوک نگل کر رہ گیا کہ کہیں اُس نے ایک بار مداخلت کی تو بچّے اس کو کمرے سے باہر نہ نکال دیں اور وہ ان کی دلچسپ باتیں سُننے سے محروم رہ جائے۔

"تو پھر بھیا وہ ٹرین گپھا سے کیسے نکلتی ہے؟" نیمو نے معصومیت سے پوچھا اس سے قبل کہ پپّو جواب دے کچن سے ماں کی آواز آئی "ارے کمرے میں کیا میٹنگ ہو رہی ہے کیا متان بھی وہاں پر ہے؟ متان..... او متان جلدی آ..... کہاں مر گیا؟"

"آیا ماں جی..... کہتا ہوا متان کچن کی جانب بڑھ گیا۔

اور پھر کچھ دیر بعد جب وہ کمرے کا فرش صاف کر رہا تھا تب بھی سب بچّے اسی موضوع پر باتیں کر رہے تھے۔ دراصل آج کل چھٹیاں چل رہی تھیں۔ چھٹیوں کے

پیشِ نظر ہی گھر والوں نے پروگرام بنایا تھا کہ فینٹاسی کنگڈم جایا جائے۔ اسی شوق میں بچے جمع ہو کر یہ سب باتیں کر رہے تھے۔ منان سر جھکائے فرش پونچھتا جا رہا تھا اور ان کی باتیں بھی سنتا جا رہا تھا۔ اسے یہ باتیں بہت دلچسپ لگ رہی تھیں۔ بالکل ماں کی باتوں کی طرح جو اُسے کوہِ قاف کی پریوں کی کہانیاں سنایا کرتی تھی کہ شہزادہ جب گھنے جنگلوں سے گزر کر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کوہِ قاف کے پہاڑوں میں داخل ہوتا تو اسے بڑے بڑے سینگوں والے دیووں سے مقابلہ کرنا پڑتا۔ لمبے تڑنگے دیو اور جن اس کے ساتھیوں کو پکڑ کر کھا جاتے۔ شہزادہ پھر بھی ہمت نہ ہارتا اور لڑتا لڑاتا کسی نہ کسی طرح نیلم پری کے محل تک پہنچ ہی جاتا۔

یا پھر ماں زیادہ موج میں ہوتی تو جنت کے نقشے کھینچتی کہ وہاں پر اونچے اونچے پہاڑ ہوں گے۔ ٹھنڈے پانی کی نہریں ہوں گی۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی ہوگی۔ کچھ اسی قسم کی باتیں بچے بھی کر رہے تھے۔

جنت میں تو انسان مرنے کے بعد ہی جا پائے گا مگر یہاں کا پارک تو زندہ لوگوں کے لیے ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس میں بڑے لوگ اور اُن کے بچے ہی جا پاتے ہوں گے کیوں کہ ٹکٹ بہت مہنگا ہوتا ہے۔ ہم غریب اس پارک کو کیسے دیکھ سکیں گے۔

میں اگر دیکھتا تو ماں کو بتلاتا کہ تم جنت کے جن پارکوں کی باتیں کرتی ہو بالکل ویسا ہی پارک میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ پتہ نہیں یہ لوگ مجھے اپنے ہمراہ لے کر جائیں گے یا نہیں؟ کاش میں بھی اُن کے ہمراہ جا سکتا۔

اور جب اُس نے یہ مژدہ سنا کہ وہ بھی بطور خدمت گار اُن کے ہمراہ جائے گا تو اس کا دل خوشی سے جھوم اُٹھا۔

روانگی کا وقت چار بجے مقرر ہوا تھا۔ وہ بے چینی سے چار بجنے کا انتظار کرتا ہوا گھر کے کاموں میں جُت گیا تا کہ جلدی سے کام ختم کر لے۔

تین بجے سے ہی سب اپنا اپنا لباس تبدیل کرنے لگے تو اس نے بھی اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی اور دل مسوس کر رہ گیا۔ بھلا اس کے پاس اور دوسرے اچھے کپڑے کہاں

تھے جو وہ بھی کپڑے بدلتا۔ ووکس ویگن میں جب سب سوار ہو گئے تو وہ بھی دو لمبی سیٹوں کے درمیان ان کے پیروں کے پاس گاڑی کے فرش پر بیٹھ گیا۔

ایک لمبے سفر کے بعد ملگجے اندھیرے میں جھلملاتی روشنیاں دور سے نظر آئیں تو پپّو چیخا دیکھو وہ رہا فینٹاسی کنگڈم۔ سب بچوں نے مل کر تالیاں بجائیں۔ منان نے بھی نیچے فرش سے اُچک کر روشنیوں کو دیکھنا چاہا تو راجو اس کے سر کو اپنے ہاتھ سے نیچے دباتے ہوئے بولا "ابے بیٹھ کہاں منہ کے سامنے دیوار بنا جا رہا ہے۔"

راجو دھم سے نیچے فرش پر بیٹھ گیا اور منہ اُٹھا کر بچوں کی جانب دیکھنے لگا جہاں اُن کی خوشی سے پھیلی ہوئی آنکھوں میں جلتی بجھتی بتیوں کا عکس اندھیرے میں یوں نظر آ رہا تھا جیسے آئینہ ٹوٹ گیا ہو اور کانچ کے ہر ٹکڑے میں روشنی اُتر آئی ہو۔

کچھ ہی دیر میں ان کی ویگن کار کنگڈم کے احاطے میں داخل ہو کر رُک گئی تو سب بچے بھڑ بھڑا کر ایسے نکلے جیسے کبوتروں کی کابک کھول دی گئی ہو۔ ان کے تعاقب میں منان نے بھی کسی مینڈک کی طرح جست لگائی۔ سامنے ہی فینٹاسی کنگڈم کا بہت بڑا گیٹ جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ جلتی بجھتی بتیوں اور طرح طرح کے رنگین نیون سائن کی روشنیوں کو دیکھ کر اس کے وجود میں خوشی کی لہریں دوڑنے لگیں۔ اُس کا منہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا اور وہ مبہوت ہو کر نیون سائن سے بنے پانی کے آبشاروں اور چکر لگاتے چرخ جیسے جھولوں... چھوٹے چھوٹے قمقموں سے بنے اُچھلتے کودتے خرگوشوں اور ہرنوں کو تکنے لگا کہ اس کے سر پر ایک دو ہتڑ پڑا۔ "ابے ایسے کیا حیران ہو رہا ہے۔ اندر جائے گا تو سبھی پتہ چلے گا۔ کہاں آ گیا؟" یہ پپّو تھا جو اپنی سینئرٹی جتلانے کے لیے اُسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے صاحب نے گاڑی کا دروازہ دھب سے بند کیا اور چابی اپنی پتلون کی جیب میں ڈالتے ہوئے منان سے مخاطب ہوئے "منان تمہیں یہیں گاڑی کے پاس رہنا ہے۔ اِدھر اُدھر مت جانا ورنہ گاڑی کا شیشہ وغیرہ توڑ کر کوئی لے جائے گا ہم جب تک نہ آئیں یہاں سے ہلنا مت سمجھے...!"

جیسے ایک ہی پل میں زلزلہ آ گیا ہو اور فینٹاسی کنگڈم کی عمارت معہ اپنی رنگینیوں

کے نیچے زمین پر آ رہی ہو۔ ویسے ہی اس کے خوابوں کا جگمگاتا محل اڑ اڑا دھم کر کے زمین بوس ہو گیا۔ اس نے خالی خالی نظروں سے صاحب کی جانب دیکھا جیسے ان کی بات سمجھ میں آئی ہی نہ ہو۔ تب صاحب نے جھلا کر کہا "ابے ایسے کیا دیکھ رہا ہے کیا میں کوئی عربی بول رہا ہوں بات کو سمجھا یا نہیں؟"۔ "ہاں صاحب....." جواب میں منان کے منہ سے عجب طرح کی مریل سی پھنسی ہوئی آواز نکلی جیسے کسی لڑکی سے اس کی مرضی کے خلاف زبردستی نکاح کے وقت 'ہاں' کہلوائی گئی ہو۔ صاحب نے اس کے حلق میں گھٹتی ہوئی رقت کی چیخ کو سن کر تیکھی نظروں سے دیکھا پھر بھنا کر بولے "چل، یہ سامان اٹھا اور گیٹ تک پہنچا دے۔"

میوزک کے انسٹرومینٹ اٹھائے ہوئے منان کنگڈم کے گیٹ تک آیا اور جب وہ سب جنت میں داخل ہو گئے تو اس نے کسی گنہگار کی طرح ایک ٹھنڈی سانس بھری اور حسرت سے کھڑا جنت کے بند دروازے کو دیکھتا رہا پھر شوق نے اکسایا تو وہ آگے بڑھا اور گیٹ کے سامنے دونوں کواڑوں کی درزیں سے جھانک کر اندر کا نظارہ کرنے لگا۔ ابھی اس کی نگاہیں حوروں کی تلاش میں بھٹک ہی رہی تھیں کہ دھب سے اس کی کمر پر ایک ڈنڈا پڑا۔ وہ بلبلا گیا۔ پلٹ کر دیکھا تو رضوان (دربانِ جنت) اس کے سر پر کھڑا دوسرے حملے کے لیے ہاتھ اٹھائے کھڑا ہے۔ "ابے شیطان تو یہاں کیا کر رہا ہے جا بھاگ یہاں سے۔"

وہ کود کر وہاں سے بھاگا تو سامنے ہی دو سو ٹکے فیس داخلہ کی تختی اسے منہ چڑا رہی تھی۔ اسے ماں کی یاد آئی جو کہا کرتی تھی شاید جنت میں بھی یہ دولت مند ہی جائیں گے، کیوں کہ دان پن کرنے کا ثواب انھیں ہی ملتا ہے۔ بھلا ہم غریب نوکر چاکر مالکوں کی خدمت کریں یا نمازیں پڑھیں ارے ہم محنت کرنے والے تو آسانی سے روز بھی نہیں رکھ سکتے۔ پھر بھلا ہمارا گزر جنت میں کیسے ممکن ہے؟ وہ سر جھکائے ہوئے جاتا رہا اور ان لوگوں کی بھیڑ میں آ کر شامل ہو گیا جہاں اس کے جیسے قبیل کے لوگ کنگڈم کے گیٹ سے دور نیم دائرے کی شکل میں کھڑے نیون سائن کی بتیوں کے کمالات حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

جب کوئی شخص کنگڈم میں داخل ہوتا تو منان اُسے حسرت سے دیکھتا۔ آخر اس نے ایک فیصلہ کیا کہ وہ پیسے جمع کرے گا اور کنگڈم کو اندر سے ضرور دیکھے گا۔

اب مشکل یہ تھی کہ پیسے کیسے جمع ہوں وہ اپنی پوری تنخواہ جو کہ صرف چار سو ٹکے ہوتی تھی ماں کو بھیج دیا کرتا تھا جہاں گاؤں میں اس کی ماں کے علاوہ دو بہنیں اور بھی تھیں۔ اس معمولی سی رقم سے ان کی خوراک بھی نہیں ہو پاتی تھی۔ پھر وہ اس رقم میں کٹوتی کیسے کر سکے گا؟ وہ سوچتا رہا اچانک اسے خیال آیا آئندہ ماہ سے گاؤں میں دھان کی کھیتیاں کٹنا شروع ہو جائیں گی تو ہمیشہ کی طرح ماں اور بہنوں کو دھان کٹائی کی مزدوری ملنے لگے گی تو گنجائش نکل سکتی ہے۔

پھر جب ایک ماہ بعد اُسے تنخواہ ملی تو اس نے پچاس ٹکے روک کر باقی کی رقم ماں کو بھیج دی۔ رات کو جب وہ سونے کے لیے لیٹا تو اس نے بڑے چاؤ سے پچاس کے نوٹ کو اپنی جیب سے نکالا کچھ دیر تک پیار بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر بڑی احتیاط سے وہ نوٹ اس نے اپنے بیگ میں رکھ دیا۔ بہت دیر تک اسے نیند نہیں آئی اس کی آنکھوں میں جلتی بجھتی بتیوں کے چرخ گھومتے رہے پھر جب اسے نیند کی دیوی نے اپنے آغوش میں لے لیا تو وہ فینٹاسی کنگڈم میں داخل ہو کر بجلی کے جھولوں میں جھولنے لگا اور جب ریل گاڑی گپھاؤں کے اندر گئی تب ایک بھوت نے اس کو پکڑ کر ٹرین سے نیچے کھینچنا چاہا تو ڈر کے مارے اس کا دم نکل گیا۔ اتنے میں ایک چڑیل اور آگئی اس نے منان کا منہ نوچنے کے لیے اپنے بڑے بڑے پنجے آگے بڑھائے تو وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ بھتنی ہا ہا ہا کر کے چیخنے لگی۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپتا رہا۔ بھتنی کی چیخیں بڑھتی گئیں کہ اس کی آنکھ کھل گئی مگر چیخ و پکار اب بھی جاری تھی۔ تب ہی اس کا احساس جاگا کہ وہ اپنے بستر پر لیٹا ہے اور مالکن اس کے سر پہ کھڑی چنگھاڑ رہی ہیں۔ ارے صبح کب کی ہو گئی، اور تو اب تک پڑا سو رہا ہے۔ آج کیا بات ہے اُٹھتا کیوں نہیں" وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

پھر بڑی بے چینی اور کرب سے اس نے تین ماہ اور کاٹے۔ جب چوتھے مہینے کی

تنخواہ ملی تو اس کے پاس دو سو ٹکے جمع ہو چکے تھے۔ بیس ٹکے اس کے پاس عید کی بخشش میں ملے ہوئے پہلے ہی سے رکھے تھے۔ اب اس نے خوابوں کی دنیا میں جانے کا پروگرام بنایا۔ رات کو خوب مل مل کر اپنی پتلون اور شرٹ صاف کی۔ صبح اٹھ کر ان پر استری کی اور گھر کے کام نمٹانے کے بعد مالکن سے اجازت لے کر گلستان کے علاقے کی طرف چل دیا جہاں اسے فینٹاسی کنگڈم کے لیے جام گوڑہ کی بس پکڑنا تھی۔

بس اسے اس کی منزل سے نصف کیلو میٹر پہلے ہی اتار کر دوسری جانب مڑ گئی۔ شام ہونے میں ابھی دیر تھی۔ پھر بھی اسے وہاں سے فینٹاسی کی روشنیاں جھلملاتی نظر آ رہی تھیں۔ ان روشنیوں کی جگمگاہٹ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بھی خوشی کے چراغ جل اٹھے۔ وہ اپنے شوق میں کھویا ہوا لمبے لمبے قدم بڑھاتا روشنیوں کی جانب بڑھتا رہا۔ ہر ہر قدم پر اس کا خون ایک ایک چلو بڑھتا جا رہا تھا۔ جب وہ کنگڈم کے احاطے میں داخل ہوا تو خوشی اور سرشاری کے احساس سے اس کا چہرہ یوں لال ہو گیا جیسے کسی سیٹھ کو اپنے کاروباری سودے میں لاکھوں کا منافع ہو گیا ہو۔

وہ داخلے کے گیٹ کے قریب پہنچا تو اسے دیکھ کر دربان نے اپنا ڈنڈا سنبھالا۔ منان نے ایک تمسخرانہ نگاہ دربان پر ڈالی جیسے کہہ رہا ہو آج ہماری جیب میں بھی پیسے ہیں آج ہم بھی اپنی خوابوں کی دنیا کی سیر کریں گے ''۔ وہ بڑی ادا سے گردن اکڑا کر چلتا ہوا ٹکٹ کی لائن میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

لائن دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ اچک اچک کر ٹکٹ کاؤنٹر کو دیکھتا اور کبھی اپنے آگے کھڑے ہوئے لوگوں کی گنتی گنتا کہ اب کتنے آدمی رہ گئے ہیں۔ خدا خدا کر کے وہ ٹکٹ کاؤنٹر تک پہنچا تو اس نے اپنی گردن کو خم کر کے ایک ادا سے بے نیازی سے ٹکٹ بابو کو دیکھا اور پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کا ہاتھ جیب سے پھسل کر یوں باہر نکل گیا جیسے جیب میں گھلا ہوا صابن لگا ہو۔ اس نے گھبرا کر اپنی کٹی ہوئی جیب کو دیکھا اور جلدی جلدی اپنی پتلون کی دوسری جانب کی جیبیں ٹٹولنے لگا مگر وہ تو سب خالی تھیں۔

آن کی آن میں جیسے کسی نے اسے آسمان سے نیچے دھکیل دیا۔ وہ نیچے اور نیچے

گرتا ہوا زمین سے آٹکرایا۔ ایک دھماکہ ہوا۔ فینٹاسی کنگڈم کے جلتے بجھتے قمقموں کا فیوز اُڑ گیا۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا۔ وہ گلا پھاڑ کر چینخا "ہائے میرے روپیے.... میری جیب کسی نے کاٹ لی....."

اُس کو روتا بلکتا دیکھ کر دو منٹ کے لیے ٹکٹوں کی بکری رُک گئی۔ آس پاس کھڑے لوگوں نے اس کی بات سُنی۔ اُس سے دریافت کیا کہ وہ کہاں سے آیا ہے۔ کچھ لوگوں نے ہمدردی کے بول کہے اور کچھ کے چہروں پہ دُکھ کے سائے بھی لہرائے تاہم ٹکٹوں کی فروختگی دوبارہ شروع ہو گئی۔ لوگ اسے دیکھتے، ہمدردی سے سر ہلاتے ٹکٹ خریدتے اور فینٹاسی کنگڈم میں داخل ہوتے رہے۔

سپنے کا خوف

میں جب بھی دہلی جاتا ہوں تو وہاں کے تاریخی مقامات اور عمارتوں کو ضرور دیکھتا ہوں۔ ان میں جامع مسجد، لال قلعہ، قطب مینار سب ہی شامل ہیں۔ حالاں کہ ان سب کو بار ہا دیکھا ہے لیکن جب بھی دیکھو یہ عمارتیں اپنی ہیئت میں یگانہ اور لاثانی نظر آتی ہیں۔ انھیں دیکھ کر انسانی محنت کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ گو کہ یہ انسانی محنت و مشقت شاہوں کو عیش کوشی کا سامان فراہم کرتی اور ان کی شان و شوکت کے جذبے کو پروان چڑھاتی تھی جس کے ہم کبھی بھی طرفدار نہیں رہے۔

ہماری سوچ اور فکر کا محور تو کچھ ایسا ہی رہا جیسا کہ ساحر نے کہا ہے

یہ عمارات، یہ مقابر، یہ فصلیں یہ حصار
یہ مطلق الحکم شہنشاہوں کی سطوت کے ستون
دامنِ دہر پہ اُس رنگ کی گلکاری ہیں
جس میں شامل ہے ترے اور مرے اجداد کا خوں

اس حساب سے ان عمارتوں کے ساتھ ہمارا کچھ خونی قسم کا رشتہ بھی نکل آیا۔ شاید اس کشش کا نفسیاتی سبب یہی ہو جو ہم بار بار ان کو دیکھنے جاتے ہیں۔

بہرحال جو کچھ بھی ہو ان عمارات کی ہیبت و سطوت اور وقار کی سچائی سے منہ نہیں موڑا جا سکتا۔ ان سب میں ایک نیرنگیِ کمال ہے۔ یہ انسانی مشقت اور ہنر کی منہ بولتی تصویریں ہیں ہاں تو بات ہو رہی تھی ان عمارات کو بار بار دیکھنے کی۔ اپنے کام سے فارغ ہونے

کے بعد جب میں نے اپنے ساتھی اور بے تکلف دوست نعیم سے کہا کہ اب ذرا تاریخی عمارتیں بھی دیکھ لی جائیں تو وہ ہنس دیے اور بولے۔

"یہ عمارتیں ہیں یا کوئی گلستاں جس میں نئے نئے پودے اور پھل پھول اُگتے رہتے ہیں اور تم بدلے ہوئے موسموں میں ان کی بہار سے جی بہلاتے ہو؟ پچھلی بار ہی تو تم نے ان عمارات کا کونہ کونہ چھان مارا تھا۔ ان میں اب کون سے نئے در و دیوار اُگ آئے جو پھر وقت برباد کرنا چاہتے ہو۔ یار ہم تو تمھیں ایک ترقی پسند اور جدید ذہن کا انسان سمجھتے تھے لیکن تم تو قدامت پسندی کے حصار میں قید دکھلائی دیتے ہو۔"

"ہائے میری جان! یہ ترقی، یہ جدیدیت کیا ہے؟ ایک عرفان، ایک گیان، جو ہمیں روشنی کے میناروں پر پہنچا رہا ہے۔ ان میناروں کے بطون کیا ہیں؟ ہماری وہی پرانی اساس جس پر ہمارا ہیکل کھڑا ہے، جہاں سے ترقی کرتے ہوئے ہم بتدریج آگے بڑھ رہے ہیں اور اگر ہم نے اپنی اساس کو ہی کھو دیا تو پھر شاید ہماری حیثیت کسی کٹی ہوئی پتنگ سے زیادہ نہ رہے جو فضاؤں میں ڈولتی ہوئی ہوا کے کسی تھپیڑے کی نذر ہو جاتی ہے۔

خلیل جبران کہتا ہے: "میرے گھر نے مجھ سے کہا مجھے نہ چھوڑ کہ تیرا ماضی مجھ میں آباد ہے!"

اور میرے راستے نے مجھ سے کہا "میرے پیچھے پیچھے چلا آ کہ میں تیرا مستقبل ہوں"

نعیم نے ایک قہقہہ لگایا "یار تم فلسفیوں کو پڑھتے پڑھتے خود بھی بقراط بن گئے ہو چلو جہاں دل چاہے لے چلو لیکن خدا کے لیے مجھ سے اتنی خشک قسم کی گفتگو نہ کرو۔"

"چلو تم نے مانا تو۔"

"ارے ہم تو تمھارے پرانے ماننے والوں میں سے ہیں اور تمھاری ان ہی باتوں پر فدا ہیں ورنہ پورب اور پچھم کبھی ملتے ہیں؟" انھوں نے مسکرا کر چٹکی لی۔

"پورب کی جانب چلتے چلے جاؤ ایک دن دیکھو گے پچھم آگیا۔"

"خدا کے لیے.... خدا کے لیے بور مت کرو یہ آج تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ بھوک بھی

نہیں ہونا شتہ تو تم نے میرے ساتھ ہی کیا تھا پھر یہ آج اتنے سنجیدہ کیوں ہو گئے ہو۔ اگر کوئی لطیفہ یاد نہیں آرہا ہے تو کوئی رنگین شعر ہی سنا دو۔ یہ آس پاس لہراتی تتلیوں کی باتیں کرو، حسینوں کی باتیں کرو، مہ جبینوں کی باتیں کرو۔"

"اس عمر میں؟" میں نے آنکھیں نکالیں۔

"ہر عمر میں ہر بات ہو سکتی ہے، پر ماحول گوارہ چاہیے..." وہ گنگنائے۔

"ہائیں.... ہائیں اب الٹا تم نے فلسفہ شروع کر دیا۔"

دونوں نے ایک ساتھ قہقہے لگائے اور سامنے سے گزرتی ہوئی ٹیکسی کو رُکنے کا اشارہ کیا، پروگرام بنا گاندھی سمادھی سے شروع کیا جائے۔

وہاں عقیدت کے پھول چڑھانے کے بعد ہم دونوں قطب مینار پہنچ گئے۔ لوگوں کا کافی ہجوم تھا۔ کچھ یورپین بھی تھے۔ جن کی آنکھوں میں تحسین و تعریف کے ساتھ تحیّر کی جھلکیاں بھی نمایاں تھیں۔ وہ پرانے دور کے وسائل کا ذکر کرتے ہوئے مینار کی تعمیر کے بارے میں آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ کچھ ویسے لوگ بھی جن کے ذہن کے دریچے کھلے ہوئے تھے مینار کی اونچی تعمیر اور ان بھاری پتھروں کا تاریخی حوالوں سے ذکر کر رہے تھے کہ اس دور میں جب کہ آمد و رفت کے وسائل بے حد محدود تھے اس وقت دور دراز کے ملکوں جیسے کابل قندھار وغیرہ سے یہ پتھر یہاں کس دقت اور دشواری سے پہنچے ہوں گے جب کہ کرین کی ایجاد بھی نہیں ہوئی تھی۔

بقیہ ایک بھیڑ تھی جو مینار اور اس کے ارد گرد کے در و دیوار کو بھی دیکھ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ چلتی پھرتی رنگین عمارتوں کی حسین صناعی کا بھی نظارہ کر رہی تھی۔ جن میں میرے دوست نعیم بھی شامل تھے۔

وہاں سے رخصت ہو کر ہم واپس آرہے تھے تو راستے میں ہمایوں کے مقبرے پر نظر پڑی۔ میں نے ٹیکسی والے سے رُکنے کو کہا۔ ٹیکسی چھوڑ کر جب ہم مقبرے کے چبوترے کے قریب پہنچے تو دن ڈھل رہا تھا۔ پیلی پیلی دھوپ مقبرے کی عمارت سے سمٹ کر اب گنبدوں پر تیر رہی تھی۔ شام گربہ چال چلتی آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی

نزدیک آتی جا رہی تھی۔ نعیم نے چاروں طرف دیکھا پھر گھبرا کر بولے "بھئی شام ہونے جا رہی ہے سُنا ہے یہاں جناتوں کا مسکن ہے۔ میں جھٹ پٹے کے وقت اندر نہیں جاؤں گا"

میں نے جواب میں نعیم کا ہاتھ اپنے گرفت میں مضبوطی سے لیتے ہوئے کہا "جاؤ گے کیسے نہیں۔ صبح سے تم جو ایک جنات کی ہمرہی میں گھوم رہے ہو تو تمھارا کیا بگڑا جو اب کوئی دوسرا جنات تمھیں نقصان پہنچائے گا۔"

"دیکھو جو بھی کہو میں بد اعتقاد نہیں ہوں۔ تم ٹھہرے نیچری اور مادہ پرست تم ان باتوں کو نہیں مانتے ہو تم جاؤ۔

میں نے آہستگی سے اُن کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا "جانے کو میں اکیلا چلا جاؤں گا مجھے تامل نہیں ہے لیکن تم نے یہ کس اعتقاد کی بات کی ہے۔ تمھاری کس کتاب میں لکھا ہے کہ اپنی ذہنی بزدلی کے ہوّے اختراع کر کے ان سے ڈرتے رہو۔ پھر تم خود کو کٹر مسلمان بھی کہتے ہو۔ ارے کٹر مسلمان صرف اور صرف خدا سے ہی ڈرتا ہے اور وہ کٹر انسان بھی ہوتا ہے۔ تم لوگوں نے اپنی مرضی کے طرح طرح کے مذہبی چولے پہن رکھے ہیں اسی لیے تو اپنی آفاقی شناخت کھو چکے ہو اور تم مجھے بد اعتقاد اور مادہ پرست کہتے ہو تو سُنو اعتقاد کے معنی ہیں یقین اور عقیدے کے یعنی یقین باالذات خدائے تعالیٰ کیا سمجھے میں خدا پرست ہوں اور مادہ میری کھوج اور تلاش ہے۔

میرے ان دلائل سے نعیم کچھ خفیف سے ہو گئے اور خود ہی آگے بڑھتے ہوئے بولے "چلو تمھاری معیت میں آج یہ بھی سہی۔"

اتنی دیر کی گفتگو میں شام نے اپنے دو قدم اور آگے بڑھا لیے تھے جھٹ پٹا نزدیک تھا۔ جب ہم باہری برآمدہ عبور کر کے اندر پہنچے تو جنگلی کبوتر کارنسوں پر غٹک رہے تھے۔ ان کی آوازوں کے علاوہ چہار سُو ایک ہولناک سناٹے کی حکمرانی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نیم تاریک ماحول میں بجائے اس کے کہ کبوتروں کی غٹرغوں کے صوتی اثرات میرے حاسۂ سامع پر خوشگوار اثر ڈالتے میں نے محسوس کیا وہ وہاں کے پھیلے ہوئے ہول کو مزید بڑھاوا دے رہے ہیں۔ مجھے یاد آیا نعیم کہہ رہے تھے جنات اکثر سانپ بندر

اور جنگلی کبوتروں کے بھیس میں رہتے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے نعیم کے تاثرات دیکھنے کی خاطر کنکھیوں سے ان کی جانب دیکھا۔ اُن کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس کے قبل کہ ڈر و خوف کا اثر زائل کرنے کے لیے میں ان سے کوئی بات کہوں وہ بد کے اور لمبے لمبے قدم اُٹھاتے برآمدہ پار کر گئے۔

میں ان کی حالتِ زار پر مُسکرا کر خاموش ہو گیا۔ پھر میں نے شاہوں کے مدفن، ان کی بے سر و سامانی، بے کسی اور بے چارگی پر غور کرنا شروع کیا ہی تھا کہ ہول کے رینگتے ہوئے بچھو میرے اطراف میں سرسرانے لگے۔ دہشت کی ایک لہر نے ہمت اور خود اعتمادی کی عمارت کو متزلزل کرنا شروع کر دیا۔ میں نے گھبرا کر اپنا سر اوپر اُٹھایا اور گنبد کی اندرونی گولائی کے نقش و نگار پر غور کرنے لگا کہ اچانک خوف و ہراس کی ایک لہر میرے سراپا میں سرایت کرتی چلی گئی۔ میں نے اپنی قوتِ مدافعت کو جمع کیا اور اپنے اطراف میں نگاہیں گھما پھرا کر خوف کے اسباب کا جائزہ لینے لگا۔ بات کچھ بھی سمجھ میں نہیں آئی تو پھر میں بھی وہاں سے چلا آیا۔

میں جو بچپن سے ہی نہایت نڈر اور ہمت والا رہا ہوں اپنے لڑکپن کے زمانے میں رات کی تاریکی اور سناٹے کے باوجود ویران کھنڈروں میں چلا جایا کرتا تھا۔ کوئی اَن دیکھی قوت ہو یا ظاہر میں نظر آنے والی صورت میں کبھی کسی سے نہیں ڈرا لیکن آج مجھے یہ اقرار کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں واقعی گھبرا گیا۔

میں غور کرتا رہا شاید یہ نعیم کی باتوں کا نفسیاتی اثر ہو یا پھر میرے اعصاب اور حواس ہی کمزور ہو گئے ہیں لیکن پھر بھی کچھ تو ہے جس کا میرے اعصاب مقابلہ نہیں کر سکے وہ بھید وہ اسرار کیا ہے؟ انسانی ذہن کی رسائی ابھی تک وہاں نہیں ہوئی ہے کہ ان عقدوں کو حل کر سکے۔ شاید... شاید۔

میں ان ہی سوچوں میں گم ٹیکسی میں بیٹھ کر نعیم کے ہمراہ ہوٹل تک پہنچ گیا۔

دوسرے دن نعیم کو کچھ کام تھا تو میں نے کہا تم اپنا کام نمٹاؤ تب تک میں ذرا لال قلعہ دیکھ ڈالوں۔ میری بات سننے کے بعد نعیم کے چہرے پہ ایک بھرپور مسکراہٹ دوڑ گئی۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے: ”تمھارا ابھی تک دل نہیں بھرا، جاؤ تم اپنے شوق دیوانگی کو پورا کرو اور میں ذرا اپنے وقت کو کام میں لگا آؤں۔۔۔ خدا حافظ۔“ دونوں نے الگ الگ سواریاں پکڑیں اور روانہ ہو گئے۔

لال قلعے کے دروازے پر ایک پچیس چھبیس سالہ لڑکا مجھ سے مخاطب ہوا۔
”بابوجی کیا قلعہ کی سیر کیجیے گا؟“
”ظاہر ہے میں اسی ارادے سے یہاں آیا ہوں۔“ میرا جواب تھا۔
”تو پھر آپ کو گائیڈ بھی چاہیے؟“
”نہیں قلعہ میرا دیکھا ہوا ہے۔“
”لیکن مجھے یہاں کے واقعات اور ان پر گزرنے والے حالات کی تاریخ اچھی طرح یاد ہے جب ایکس پلین کروں گا تو بات ہی کچھ اور ہو گی۔“
”اچھا بابا ٹھیک ہے! ویسے بھی مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔“
میرے حامی بھرتے ہی گائیڈ نے اپنے پیشہ ورانہ انداز میں اسٹارٹ لیا ”دیکھیے یہ قلعہ جو کہ سرخ پتھروں کا بنا ہوا ہے۔ اس کو شاہ جہاں بادشاہ نے جمنا دریا کے دائیں جانب بنوایا تھا۔ شاہ جہاں نے آگرے پر گیارہ سال حکومت کرنے کے بعد وہاں کی تپش اور گرمی سے پریشان ہو کر اپنا پایۂ تخت دہلی لانے کا فیصلہ کیا۔ ۱۶۳۹ء میں اس قلعہ کا سنگ بنیاد رکھا اور نو سال تین ماہ میں اس وقت کے آرکی ٹیکٹ کرم خاں کی نگرانی میں یہ قلعہ مکمل ہوا۔ اس وقت اس پر نو کروڑ روپے خرچ ہوتے تھے جس کی لاگت کا آج کی کرنسی میں ٹھیک اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس کی لمبائی۔۔۔
”ارے ارے! میرے بھائی اتنی تیزی مت دکھلاؤ کچھ مجھے بھی سمجھنے دو اور پھر میں اپنی ڈائری بھی نہیں لایا ہوں ورنہ تمھارا کہا ہوا سب نوٹ کرتا جاتا۔“ میں نے گائیڈ کی اسپیڈ کو بریک کیا تو وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

ہم کچھ اور آگے بڑھے۔ ”یہ دو منزلہ عمارت نوبت خانہ ہے اور یہ دیوانِ عام ہے، یہ دیکھیے زمین سے دس فٹ اونچی ماربل کی بنی ہوئی یہ کرسی ہے اس میں پھل پھول

پرندے اپنی اصلی ہیئت میں نقش کیے گئے تھے۔ اس میں ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے جو غدر میں فرنگی نوچ کر لے گئے۔

یہ رنگ محل ہے اس کی چھت کبھی چاندی کی ہوا کرتی تھی جس پر جواہر کے ساتھ طلائی پھول پتیوں کا کام کیا ہوا تھا۔ بیگمات اور شہزادیاں یہاں سے ہاتھیوں اور دوسرے جنگلی جانوروں کا مقابلہ دیکھا کرتی تھیں جو کہ سامنے کے میدان میں منعقد ہوتا تھا۔

میں نے گائڈ کی جانب حیرت سے دیکھا "ارے بھئی یہ گنگا جمنی زبان تم اس دور میں اپنے صحیح لب و لہجے میں کیسے بول لیتے ہو کیا تم نے اُردو پڑھی ہے؟"

میرے اس سوال پر خوشی سے اس کی بتیسی کھل گئی اور وہ اپنے سفید دودھ جیسے دانت چمکاتا ہوا بولا "میں انگریزی بھی بول لیتا ہوں۔ خوب اچھی طرح ہیں میں نے چہرے بشرے سے آپ کو اُردو داں سمجھا اس لیے یہ زبان بول رہا ہوں میرا نام سلیم ہے میں نے اُردو میں ایم اے کیا ہے۔ کوئی اور کام نہیں مل سکا تو گائڈ ہی بن گیا۔ اس میں مجھے آسانی ہے کیوں کہ ہسٹری میری پڑھی ہوئی ہے۔"

ہم کچھ اور آگے بڑھے۔ گائڈ نے ایک عمارت کی جانب اشارہ کیا "یہ دیوانِ خاص ہے جو ایک زبردست تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ شاہ دیوانِ عام برخاست کرنے کے بعد یہاں بیٹھ کر خاص اور اہم مشاورت کیا کرتے تھے۔ اس کی چھت بھی چاندی ہی کی تھی اور زر و جواہر سے منقش تھی جس کو ۱۷۶۰ء میں جاٹ لوٹ کر لے گئے کہتے ہیں یہ جگہ ان دنوں جنت سے کم نہیں سمجھی جاتی تھی۔ یہاں پر ہی تخت طاؤس تھا جو کہ ایک لاکھ تولے سونے کا بنا ہوا تھا اور اس میں نہایت بیش قیمت جواہرات جڑے ہوئے تھے ۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ دہلی لوٹنے کے بعد واپس ایران گیا تو کوہِ نور ہیرے کے ساتھ تخت طاؤس بھی اپنے ہمراہ لیتا گیا۔

یہ خاص محل ہے۔ اس کا تسبیح خانہ دیکھیے۔ وہ سامنے موتی مسجد ہے۔ جس کو اپنے خاندان والوں کے لیے ۱۶۶۲ء میں اورنگ زیب نے بنوایا تھا۔

گائڈ مجھے قلعے کے بارے میں چھوٹی بڑی تمام تفصیلات معہ تاریخی حوالوں کے

بتلا رہا تھا اور میں آہستہ آہستہ ماضی میں گم ہوتا جا رہا تھا۔

گائڈ میری بے خودی کو دیکھ کر مجھ سے کہتا، "صاحب جلدی کیجیے یہ شاہی حمام ہے، اور یہ حجرو کے ہیں اور یہ...!"

اپنے ماہرانہ انداز میں گائڈ بولتا رہا اور میں کسی اور ہی دنیا میں کھو گیا۔ آج سے تین سو ساڑھے تین سو سال پرانی دنیا باوقار شاہان ہند، عظیم الشان دربار، باوفا مصاحبین۔ شہ زور شہزادے اور حسین شہزادیاں تصویر کے ہر رخ سے افسانے پھوٹ رہے تھے۔ میری بے خودی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گائڈ نے واپسی میں ہی عافیت سمجھی وہ میرا ہاتھ تھام کر بولا "اب واپس چلیں۔ کافی گھوم لیے آپ تھک بھی گئے ہوں گے۔"

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ بس اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا قلعے سے باہر نکل گیا۔

وہاں سے واپسی پر میں مغلوں کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ یہ عمارتیں، مساجد، مقابر، قلعے، تاج محل صناعی کے بہترین نمونے بغیر کسی کالج یونیورسٹی میں پڑھے ہوئے وہ بہترین آرکی ٹیکٹ تھے۔ ان کی عمارتیں بنا لوہے کو استعمال کیے ہوئے آج بھی تین ساڑھے تین سو سال سے ایستادہ ہیں۔ ان کے اجداد بے شک باہر سے آئے تھے لیکن ان کی نسلوں نے یہاں کی مٹی کو قبول کر لیا تھا اور اسی میں مل گئے۔ بقول غالب

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

میں سوچوں میں غرق قلعے سے اپنے ہوٹل تک پہنچ گیا۔ میرا استغراق اس وقت ٹوٹا جب میری سماعت سے لا الٰہ کی عظیم صدا ٹکرائی۔ میں نے اپنا سر اٹھا کر جامع مسجد کے میناروں کو دیکھا۔ یہ سرزمین ہند پر پھیلے ہوئے ہزاروں مینار اپنی دلکشی میں بے مثال مساجد، مقابر، قلعے یہ سب کس کا سرمایہ ہیں۔ ہمارا... ہم سب کا... مسلمانوں کا... ہندوؤں کا۔ ہندوستانیوں کا۔ پھر ہم اپنے سرمائے کے دشمن کیوں ہیں؟ بابری مسجد کیوں منہدم کر دی گئی۔ اب متھرا اور کاشی کی مساجد کے انہدام کی باتیں ہو رہی ہیں تو کیا... تو کیا کل بات تاج محل اور لال قلعے تک بھی پہنچ سکتی ہے... ہاں ہاں...!

نفرت اور تعصب کے الاؤ میں سب کچھ جل سکتا ہے۔ اپنا گھر بھی بلکہ اپنا وجود بھی۔
سوچتے سوچتے مجھے نیند کی دیوی نے تھپکنا شروع کر دیا۔
"مارو... مارو... پکڑو، پکڑو... یہ مسلمان ہے، یہ ہندو ہے، یہ مسجد ہے، یہ مندر ہے، یہ ہمارا ہے، یہ تمھارا ہے۔ ہنگامہ، فساد، آگ، دھواں، خون.... دردناک چیخیں، زخمیوں کی کراہیں، دم توڑتے ہوئے لوگوں کی آخری ہچکیاں، لاٹھی چارج، کرفیو...

صبح کے اخبار میں سرخیاں، لال قلعہ کا گھراؤ، پانچ ہزار کٹر دھرمیوں نے لال قلعے کو گھیر لیا۔

یہاں کھدائی ہو گی!
پنڈت شو نرائن کی کتاب پراچین بھارت کا حوالہ یہاں مندر تھا۔
جے پال ٹھاکر کی تقریر قلعہ توڑ دو مندر بناؤ
ایڈووکیٹ میاں سلامت خاں کا جواب کتاب حال ہی میں لکھی گئی ہے لغو ہے، اس میں تاریخ مسخ کی گئی ہے۔
جواب... الجواب...
اخباروں کی سرخیاں منصف ہمت لال کی عدالت میں مقدمہ معاملے پر غور (خونی)
جنونی عفریتوں کا لال قلعے پر حملہ
کھدائی میں کرشن جی کی مورتی برآمد
ثبوت مل گیا
قلعہ توڑ دو
مندر بناؤ
آوازیں... آوازیں... شور غل
لال قلعہ اڑا دو، بم، ڈائنا مائیٹ، دھماکے... دھماکے" خوف سے میرے دانت بج رہے ہیں۔

اُف سردی… پھر دھماکہ، بجلی کی چمک، کڑک

میری آنکھ کھل جاتی ہے، موسلا دھار بارش ہو رہی ہے

میں اپنی آنکھیں مونڈے مونڈے دیکھتا ہوں۔ کھڑکی سے باہر آسمان پر رعد کی حشر سامانی نظر آ رہی ہے۔ طوفانی ہوا کے جھکڑوں سے سیٹیاں سی بج رہی ہیں۔ ایک بار پھر بجلی چمکتی ہے اور کڑک سے میرا کلیجہ دہل جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ میرے اوسان بحال ہوتے ہیں۔ زیرو بلب کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ ہوٹل کا وہی کمرہ ہے۔

تو… تو… یہ سب خواب تھا، سپنا

کچھ دیر گذرتی ہے دھیرے دھیرے طوفان ختم ہو جاتا ہے۔ میں برآمدے میں نکل آتا ہوں۔

دیکھتا ہوں رات کی تاریکی دم توڑ رہی ہے۔ صبح کے آثار ہو چکے ہیں۔ جامع مسجد سے فجر کی اذان کے ساتھ خالقِ کائنات کی کبریائی کے اعلان کی مہک سوئی سوئی فضا میں رچ جاتی ہے۔ نسیمِ سحر کے خنک جھونکے میرے جسم سے ٹکراتے ہیں اور میری پراگندہ ذہنی زائل ہونے لگتی ہے۔

پو پھٹنے لگی ہے۔ آزاد فضا میں ننھے منّے پرندے اِدھر اُدھر اُڑ رہے ہیں۔ ایک نئے دن کی آمد پر چڑیاں چہچہا چہچہا کر آپس میں اٹکھیلیاں کر رہی ہیں۔

سورج نکلنے والا ہے اور میں عرفان و گیان کے سورج کے انتظار میں اپنی نگاہیں مشرق کی جانب جما دیتا ہوں۔

ڈھلان سے اُبھرتا سورج

اُس نے ریلوے پلیٹ فارم پر بنے پُل پر چڑھ کر ایک گہرا سانس کھینچا پھر آہستہ آہستہ اپنے پھیپھڑوں سے ہوا خارج کرتے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔
سامنے سے ایک قلی اپنے سر پر دو سوٹ کیس اُٹھائے اس کی جانب بڑھتا آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک بابو اپنا بریف کیس لٹکائے لپک لپک کر قلی کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔
پُل کے عین وسط میں جنگلے کو تھام کر اُس نے نیچے جھانکا۔ مرکری بلب کی سفید روشنی میں پٹریاں بہت دور تک چمک رہی تھیں۔ داہنی جانب کے پلیٹ فارم کو ٹین کے بنے شیڈ نے پوری طرح چھپا رکھا تھا لہٰذا وہاں سے دیکھ لیے جانے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ بائیں جانب کے نمبر ۲ پلیٹ فارم پر بھی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چار پانچ قلی پاؤں پھیلائے بیڑیاں پی رہے تھے۔ اُن کے سامنے ہی ایک کتا خالی دونا چاٹ رہا تھا۔ اُس نے گھوم کر اپنی پُشت کی جانب دیکھا۔ دور سگنل کی سرخ بتّیاں نظر آ رہی تھیں وہاں ملگجے اندھیرے میں ریلوے انجن شنٹنگ میں مصروف تھے۔
چاروں طرف کا خوب اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد وہ بڑبڑایا۔ جلدی کرنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ پُل پر پھر کوئی آجائے۔ اس نے نیچے جھانکا اور اونچائی کا جائزہ لینے لگا۔
"کیا میں یہاں سے گر کر مر سکوں گا؟"
ہاں اگر سر کے بل گرا تو موت یقینی ہے۔

اور اگر سر کے بل نہیں گر سکا تو......تو؟

تو پھر اپاہج تو ضرور ہو جاؤں گا۔

"نہیں، نہیں میں اپاہج بننا نہیں چاہتا

مجھے تو موت چاہیے۔ صرف موت..... موت ہی میرے غموں کا علاج ہے۔ میرے دکھوں کا مداوا، یہ رنج وغم یہ حسرت ویاس، یہ کربناک زندگی اسے موت کے آغوش میں دے دوں، تو پھر سکون ہے۔

ابدی سکون

مگر طریقہ کیا ہو.....؟

ایسا نہ ہو جلد بازی میں کھیل بگڑ جائے اور ایک بار پھر تقدیر میرے اوپر قہقہے لگائے۔

وہ سر جھکائے سوچتا ہوا دھیرے دھیرے پل پر سے نیچے اترنے لگا۔

سامنے جہاں سگنل ہیں وہاں خاصا اندھیرا ہے۔ پٹری پر کیوں نہ لیٹ جاؤں تو پھر موت یقینی ہوگی۔

اس نے تصور میں اپنی کٹی ہوئی لاش کو دیکھا اور مسکرا دیا۔

تو گویا میری بدقسمتی کے خاتمے کا وقت آ ہی گیا، وہ بدقسمتی جس نے میری پیدائش سے قبل ہی جنم لے لیا تھا۔

باپ مجھے ماں کے پیٹ میں چھوڑ کر چل بسا۔ دکھیا بیوہ نے جنا۔ پھر وہ مفلس محنت مشقت کر کے پروان چڑھانے لگی تو قدرت نے ایک اور ستم کیا۔ مجھے چیچک جیسے موذی مرض نے آدبوچا۔ میرے سارے جسم پر دانے ہی دانے۔ مناسب علاج نہ ہونے کی بنا پر دانے پک کر سڑنے لگے۔ ان میں مواد بھر گیا۔ غریبی اور مفلسی کے شکنجے میں پھنسی میری ماں مجھے دیکھتی آہیں بھرتی اور خدا سے میری زندگی کی دعائیں کرتی۔ اس کی لگن اور دن رات کی خدمت رنگ لائی۔ میں دھیرے دھیرے اچھا ہونے لگا اور بالآخر بچ گیا۔ لیکن صورت کریہہ ہو گئی پورا چہرہ داغوں سے بھر گیا۔ بائیں آنکھ بھی جاتی رہی۔ کالا رنگ تو قدرت نے پہلے سے ہی دے

رکھا تھا لوگ مجھے دیکھتے اور نفرت کرتے لیکن میری ماں مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لیتی اور کہتی تُو تو میرا چاند ہے، چاند بابو ہے۔ ایک دن تُو بڑا آدمی بنے گا، اپنے خاندان کا نام روشن کرے گا۔ میں اپنی ماں کی باتیں سمجھ نہ پاتا۔ بس اس کی گود میں لیٹا ٹکر ٹکر اس کی صورت دیکھا کرتا جہاں سے پیار و محبت کے چشمے پھوٹ کر مجھے نہال کر رہے تھے۔ میری ماں کو مجھے قابل آدمی بنانے کا زبردست جنون تھا۔ اس نے مجھے کم عمری میں ہی اسکول میں داخل کرا دیا۔ میں بھی تیز نکلا جو کچھ پڑھتا وہ یاد ہو جاتا۔ اپنے کلاس میں ہمیشہ فرسٹ آتا۔ دوسرے لڑکے مجھ سے جلتے۔ مجھے کانا، کبھی کُھترا کہہ کر پکارتے۔ میں دل برداشتہ روہانسا ہو کر گھر آتا۔ میری ماں پھولوں کی طرح مسکراتی میرے آنسو پونچھتی مجھے پیار کرتی۔ میں اس کے آغوش میں چلا جاتا۔ تب کوئی غم نہ رہتا، کوئی جلن نہ رہتی، کوئی سوزش نہ رہتی۔ پھر یہ میرا معمول بن گیا۔ مجھے جب بھی زمانے کے دھوپ کی تمازت ستاتی میں کسی مچھلی کی مانند گرداب سے اس کے ٹھنڈے آغوش میں ڈوب جاتا، اس کی راحت میں کھو جاتا۔ اس بات سے بے خبر کہ یہ مُسکراتی گنگناتی ندی آگے جاکر وقت کے سمندر میں خود کو کھو دے گی اور میں یکہ و تنہا اس دنیا کے سمندر کی اُٹھتی موجوں سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو جاؤں گا۔

ابھی میں نے نویں کلاس پاس ہی کیا تھا اور دسویں میں گیا تھا کہ میری ماں نے میری بڑی بہن کی بڑھتی ہوئی عمر اور اپنی مفلسی سے گھبرا کر اس کی شادی اپنی ہی عمر کے ایک مرد سے کر دی۔ چھوٹی بہن نے دیکھا، اپنی بے بسی کو محسوس کیا تو گھبرا گئی۔ وہ اپنی جوانی کا بوجھ نہ سہار سکی۔ اُس نے آشنائی پیدا کر لی اور بھاگ گئی۔

میری ماں جس کو اپنی تنگ دستی اور مفلسی کے باوجود اپنی عزت کا بڑا پاس تھا ٹوٹ کر چکنا چور ہو گئی۔ جو لوگوں کی طعنہ زنی پر ہمیشہ مسکرا مسکرا کر مجھے پیار سے دلاسے دیا کرتی تھی میری ہمت بڑھاتی تھی۔ اپنے گھر کی آبرو پر اُٹھنے والی انگلیوں کو گننے کا اس میں یارا نہ رہا، زمانے کے ترکش سے نکلتے ہوئے تیروں کا دفاع نہ کر سکی۔ لوگ اُسے زخمی کرتے رہے اور وہ دن بہ دن کمزور ہوتی گئی۔ آخر کار وہ برین ہیمبریج کا شکار ہو گئی اور میں اس دنیا میں اکیلا رہ گیا۔ کاش یہ دنیا ایسی نہ ہوتی۔ لوگ دوسروں کے جگر سے اُٹھنے والی ٹیسوں کو محسوس

کر سکتے۔ کاش اس دنیا میں بسنے والے انسان بھی ہوتے۔

وقت کے دریا میں بہتے بہتے میری کشتی جوانی کے ساحل سے جا لگی۔ اب مجھے کسی ہم سفر کی تلاش تھی۔ میں جس کسی کی جانب ہاتھ بڑھاتا حقارت سے ٹھکرا دیا جاتا۔ میں ایک دکان پر سیلزمین تھا۔ وہ دکان پر آتی اپنی مسکراہٹیں بکھیرتی۔

میں حیران مجھ پر یہ عنایتیں کیسی؟

میں نے دریافت کیا میں تو اس قابل نہیں پھر مجھ سے التفات کیسا؟ پیار کیسا؟

جواب ہوتا۔ مجھے تم جیسے ہی مرد کی تلاش ہے جو مجھ سے سچا پیار کر سکے۔

پھر نفس نے مجھے بہکایا تو میں بھی مسکرا دیا۔

مسکراہٹوں کے تبادلے میں تیزی آتی گئی۔ پھول زیادہ بکھرنے لگے۔

ہم دونوں نے مل کر ان پھولوں کو چنا اور مالا بنا کر ایک دوسرے کو پہنا دی۔

وہ میری ہو گئی تو یہ راز بھی افشا ہوا کہ وہ پیٹ سے ہے۔ اس نے تریا چرتر سے کام لے کر مجھے یقین دلایا کہ وہ بے قصور ہے اس سے زبردستی کی گئی تھی۔ مجھے اس پر رحم آیا اور گلے لگا لیا۔ اسقاط کی بات کی تو پتہ چلا وقت کافی گزر چکا ہے اب ممکن نہیں۔ میں نے اس کو بھی قبول کیا۔ بچے کی پیدائش کے بعد بچے کو اپنایا اور بطور باپ کے اپنا نام بھی دیا۔

لیکن وہ حرافہ تھی۔ اس نے میری کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ راتوں کو گھر سے غائب رہنے لگی۔ آدھی پچھلی رات کو کوئی کار آتی اور اسے گھر چھوڑ جاتی۔ وہ اس وقت نشے میں ہوتی۔ میں اس کی آوارگی پر سرزنش کرتا تو جھگڑا کھڑا ہو جاتا۔

آخر کو پتہ چلا کہ یہ تو سدا کی آوارہ ہے۔ کئی بار ابارشن کرا چکی ہے اس بار اس کی زندگی کو خطرہ تھا اسی لیے اس نے مجھ جیسے مرد کا انتخاب کیا تھا۔ اس کے آشنا گھر پر بھی آنے لگے تھے میرا کلیجہ خون ہوتا رہا۔

میں نے ہمت کی۔ اس کو اس کے یار کے ساتھ زبردستی روکنا چاہا تو وہ شیرنی کی طرح دہاڑی۔ "تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو، کبھی آئینے میں اپنا منہ دیکھا ہے؟ میں نے تمھیں منہ کیا لگا لیا تم خود کو گلفام سمجھنے لگے۔ میں تھوکتی ہوں تم پر۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میرے منہ پر

تھوک دیا۔

ایک دھماکے کے ساتھ بجلی تڑپ کر چمکی۔ میرے چاروں طرف روشنی ہی روشنی پھیل گئی۔ اس روشنی میں میری بے وقعتی مجھ پر واضح ہوگئی۔ میری ماں کا بنایا ہوا پندار ٹوٹ کر بکھر گیا۔ میرے گرد آگ ہی آگ تھی۔ میں دھڑا دھڑ جلتے شعلوں میں گھرا اسے اپنے یار کے ساتھ جاتے دیکھتا رہا۔ اس کا بچہ گڈو روکر چیخا تو میں نے اسے آواز دی۔ اس معصوم کا کیا قصور ہے اسے تو لیتی جاؤ۔

اس سنگ دل نے پلٹ کر دیکھا مسکرائی اور بولی "اب یہ تمھاری اولاد ہے تم ہی اسے سنبھالو"

اس کے یار نے ہاتھ ہلاکر مجھے ٹاٹا کہا اور گاڑی کا دروازہ ایک دھماکے سے بند ہوگیا۔

میرا سر چکرا رہا تھا اور گڈو چیخ رہا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ تاریکی ہی تاریکی۔ دھواں ہی دھواں۔

میں آسمانوں سے نیچے گر رہا تھا، نیچے اور نیچے۔ آخر کار میں چور چور ہوگیا۔ میرے شکستہ جسم کے پنجرے سے روح باہر نکلنے کے لیے پھڑپھڑانے لگی۔

غنودگی، غنودگی۔

میرے حواس میرا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ اندھیرا بڑھتا جارہا تھا۔

دور ایک سنہری کرن چمکتی نظر آئی۔ دھیرے دھیرے وہ قریب آتی گئی۔ نزدیک اور نزدیک

یہ تو کسی چہرے سے پھوٹنے والا نور ہے۔

جیسے کسی ولی کا چہرہ ہو، جیسے کسی پیغمبر کا چہرہ ہو، جیسے کوئی فرشتہ بڑھتا آرہا ہو۔

میں مبہوت ہوکر اس چہرے کو تکتا رہا اور اچانک خوشی سے چلایا۔

"ارے یہ تو اماں ہے، میری ماں ہے۔ جیسے ڈوبتے کو کشتی مل جائے، جیسے مرتے ہوئے کو مسیحا نظر آجائے۔ میں اپنے پھیپھڑوں کا پورا زور لگاکر چیخا "اماں... کہاں

چلی گئی تھی تو! آ مجھے اپنے آنچل میں چھپا لے، اپنے وجود میں سمیٹ لے"۔

ماں نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگایا، پیار کیا اور اپنے روایتی انداز میں مجھے گود میں لے کر تھپکنا شروع کر دیا جیسے چمن زار کھلنے لگے ہوں، جیسے چھما چھم برسات برسنے لگی ہو۔ میں پھولوں کے ہنڈولے میں جھولتا دنیا و مافیہا سے بے خبر خود فراموشی میں مبتلا ہوتا گیا۔

آوازیں.... کسی بچے کی آوازیں... کوئی بچہ اپنی ماں کو پکار رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو دیکھا اس حرافہ کا گڈو پاس بیٹھا رو رو کر اپنی ماں کو پکار رہا ہے۔ میں دالان کے ننگے فرش پر پڑا ہوا ہوں۔ دن کافی چڑھ آیا تھا۔ آنگن میں اترتی دھوپ کی تمازت پھیل رہی تھی۔ پھر وہی حبس، وہی گھٹن گرمی، میں لرز کر رہ گیا۔ میں اب زمانے کی کڑی دھوپ برداشت نہیں کر سکوں گا۔ اب اس دھوپ کو سہارنے کی مجھ سے سکت نہیں ہے تو... تو مجھے کیا کرنا چاہیے۔

میں سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ دھوپ اور نیچے اتر آئی۔ میرا وجود اس میں نہا گیا۔ گرمی، حبس، جلن، تپش .... میں سوچتا رہا.... آخر کار میں مسکرا دیا۔ میں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا اپنی موت کا فیصلہ۔

وہ اپنے ماضی کو یاد کرتا ہوا پل سے اتر کر پلیٹ فارم کی بینچ پر آ بیٹھا اور سوچنے لگا یہاں سب ہی خود غرض ہیں بیوی جس نے اپنے حرام کے بچے کو باپ کا نام دینے کی خاطر اس کا سہارا لیا۔

بہن جس نے اپنے یار کے ساتھ بھاگتے وقت یہ بھی نہ سوچا ماں پر کیا بیتے گی۔ رسوائی بھائی کے منہ پر کالک مل دے گی۔

ماں جس نے اپنی ممتا کی خاطر ہمیشہ جھوٹے دلاسے دیے اور مجھے مغالطے میں رکھا۔

خدا، ہاں ہاں وہ لاریب ہے۔ ماں کہتی تھی خدا اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے یہ کیسا امتحان ہے جو میری پیدائش سے قبل ہی شروع ہو گیا تھا۔ شاید ماں کی یہ بات

بھی اتنی ہی بے دم ہے جتنے اُس کے دلاسے۔ مگر، مگر.... وہ سوچتا رہا اور خالی خالی نگاہوں سے پلیٹ فارم کو دیکھنے لگا۔

خالی پلیٹ فارم، خاموشی، سنّاٹا، قُلی زمین پر اپنی ٹانگیں پسارے اپنی اپنی آمدنی کا حساب، اپنی خوشیوں کا حساب کرتے ہوئے۔

وہ بڑبڑایا "ہاں... ہاں میں نے بھی اپنی زندگی کا حساب کر لیا ہے۔ اب اس حساب کو برابر کرنے جا رہا ہوں۔ کیا ابھی سے جا کر پٹری پر لیٹ جاؤں؟ نہ.... نہ کسی نے دیکھ لیا تو پکڑا جاؤں گا۔ خودکشی کے جرم میں جیل ہو جائے گی تو پھر مجھے ٹرین کی آمد کا انتظار کرنا چاہیے۔ اچانک پٹری پر کودنا موت کو یقینی بنا سکتا ہے، موت میری موت، سکون... اور ابدی سکون۔ پھر مجھے کوئی حقارت سے نہیں دیکھے گا۔ کوئی میرے منہ پر نہیں تھوکے گا۔

مگر گُڈو کا کیا ہوگا؟ اس کے ذہن کو ایک دھچکا لگا۔

زمانہ اسے چین سے جینے نہیں دے گا۔ اسے حرامی کہے گا اور اس کا کلیجہ خون ہوتا رہے گا۔ اس کے جگر میں تپتی ہوئی برچھیاں اُترتی رہیں گی۔ پھر کیا کروں، کیا کروں؟

یہاں سے جاتی ہوئی کسی ریل میں اسے بٹھا دوں تب اس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ ہو سکے گا۔ وہ معصوم ہے اور ہمیشہ معصوم ہی کہلائے گا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد اس نے ایک گہرا سانس لیا جیسے اُس کے دل کا بوجھ اُتر گیا ہو۔ ایک نئی آواز..... وہ چونک گیا۔

"بابو جی......" کوڑھ زدہ فقیر نے اپنے سفید پٹیوں میں لپٹے ہاتھ سے المونیم کا گملا آگے کھسکایا تو ریزگاری بج اُٹھی۔ آواز کی جانب اُس نے گردن جھکا کر کوڑھی کو دیکھا جو اس کے پیروں کے پاس بیٹھا بھیک طلب کر رہا تھا۔

کوڑھی کو خود سے اتنے قریب دیکھ کر اسے زبردست کراہیت محسوس ہوئی۔ وہ اضطراری طور پر پیچھے کھسک گیا اور اپنے دونوں پاؤں زمین سے اُٹھا کر بنچ پر رکھ لیے۔

کوڑھی نے رحم طلب نظروں سے اسے دیکھا، اس کے دونوں پاؤں کے نیچے پٹیوں میں لپٹے ہوئے اور اس کے آگے پھیلی ہوئی ہتھیلی، صرف ہتھیلی، انگلیوں سے خالی ہتھیلی، سرخ

سُرخ جس کی کھال جگہ جگہ سے چٹخ کر اُکھڑ گئی تھی۔ اس پھٹی ہوئی ہتھیلی میں بے شمار لکیریں اُبھر آئی تھیں۔

تقدیر کی لکیریں

آڑی ترچھی اور متوازی لکیریں، اس نے ان لکیروں کو غور سے دیکھا۔

اتنی لکیریں، اتنے غم، اتنے دُکھ

پھر ایک جھر جھری لی اور گھبرا کر اپنی جیب کوڑھی کے گملے میں خالی کر دی۔

اس کے دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں۔ خوشی کیا ہے! غم کیا ہے؟ دُکھوں کی انتہا کیا ہے؟

اور راحت.....؟

ہاں ہاں، اس دنیا میں راحت بھی ہے جو صبر کا عنصر ہے جو شکر کا جز ہے۔

اُس نے گھبرا کر اپنے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھا مدھم اور مٹی مٹی سی۔ انھیں میں کچھ واضح اور روشن بھی۔

وہ غور سے دیکھتا رہا روشن لکیریں مزید روشن ہو گئیں۔ ان لکیروں سے پھوٹتی روشنی کی کرنیں اس کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگیں۔

اس نے اپنے ہاتھوں کو نزدیک کر کے اس کے اندر جھانکا تو اسے روشن روشن پربت نظر آئے۔ مستقبل کے پربت، بڑے بڑے اونچے اونچے بلند و بالا پربت۔

اچانک ٹرین کی وسل سے اونگھتا ہوا ماحول جاگ اُٹھا۔ ٹرین دھڑ دھڑاتی ہوئی پلیٹ فارم پر داخل ہو رہی تھی۔ شور، غل، ہنگامہ، چیخ و پکار، افراتفری۔ اُس نے اپنی اَدھ کھلی آنکھوں سے ہنگامے کو دیکھا۔ جیسے خواب سے جاگا ہو۔ انجن نے ایک اور وسل دی تو اس نے چونک کر ٹرین کی جانب دیکھا ریل کے پہیوں میں گردش، ایک اور سیٹی۔ پٹری کا جوائنٹ گردش کرتے پہیوں کے بوجھ سے نیچے دھنسا، کھٹ، پھر ایک اور کھٹ کے ساتھ برابر، رنج و غم، راحت و خوشی گڈمڈ آپس میں گلے ملتے ہوئے، کھٹ کھٹ دھڑ دھڑ... ریل نظروں سے غائب۔ اُس نے گڈّو کو گود میں اُٹھایا۔ اس کی پیشانی چومی اور آنے والے کل کا خیال کر کے مسکرانے لگا۔

بقا کی خاطر

نور محمد نے ہوش سنبھالا تو وہ مشرقی پاکستان میں تھا۔ اس کے والدین ہجرت کے کن مصائب سے دوچار ہوئے اُسے کچھ خبر نہیں۔

اُس کے والدین کی زبان اُردو تھی لہٰذا وہ بھی اُردو میڈیم اسکول میں داخل ہوا۔ بہت ذہین اور محنتی لڑکا تھا۔ کلاس میں ہمیشہ اول آتا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ باپ کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ وہ اسے ایک بڑا سرکاری افسر بنانے کے خواب دیکھنے لگے اور اسے قائدِ اعظم کالج میں داخل کرادیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ نور محمد کو شاعری کا چسکہ لگ گیا۔ پہلے اس نے ٹوٹی پھوٹی شاعری شروع کی پھر افسانہ نگاری کی جانب راغب ہوگیا۔ اب وہ رات کو دیر سے گھر آتا۔ نواب پور اور ٹیپو سلطان روڈ کے ہوٹلوں میں بیٹھا اُردو ادب کی باتیں کیا کرتا۔ دوستوں سے شعر سنتا۔ اپنی چھوٹی موٹی کہانیاں سُناتا۔

جب اس کے والد شریف محمد نے دیکھا کہ بیٹے کی دلچسپی پڑھائی میں کم ہوتی جا رہی ہے تو انھوں نے بیٹے کو سرزنش کی۔ سمجھایا سخت سُست کہا۔ مستقبل کے خواب دکھلائے۔ نور محمد نے سر جھکا کر سب کچھ سُنا اور مسکرا کر بولا۔

"ابا جان! اگر سب اسی طرح سوچتے رہیں گے تو ہماری زبان کی آبیاری کس طرح ہوگی۔ اس نئی سرزمین پر ہماری زبان کی بقا کا مسئلہ ہے۔ آپ قطعی فکر نہ کیجیے میں اپنی پڑھائی کی جانب سے غافل نہیں ہوں۔"

اور یہی ہوا بی۔ اے کے امتحان میں نور محمد فرسٹ کلاس فرسٹ تھا۔
۶۹ء میں پہلا بنگالی بہاری فساد سُہانے خواب کی بھیانک تعبیر بن کر سامنے آیا۔ نور محمد اپنے دوستوں کو خدا حافظ کہہ کر جب گھر پہنچا تو صحن میں چادر سے ڈھکی ایک لاش رکھی تھی۔ اس کے والد شریف محمد کی لاش جو آدم جی ملز کے افسر تھے کام سے واپسی پر راہ میں قتل کر دیے گئے۔ اُن کا پیٹ چاک تھا۔ خون چادر پر جم کر سیاہ پڑ چکا تھا۔ بالکل اُن کے سنہرے خواب کی مانند جس کی تعبیر رو پہلی صبح نہ ہو بلکہ ظلمات کی تاریک رات ہو۔ وہ سوچتا بھول ہم سے کہاں پر ہوئی ہے اس کا مداوا کیا ہے۔ کیا ہمارے بڑوں کو جیسا دیس ویسا بھیس کے مصداق خود کو مدغم کر لینا چاہیے تھا وہ کیسے؟

وہ کیا یہاں کے ماحول میں کھپنے کے لیے اسکول میں داخلہ لے لیتے جو کچھ بھی تبدیلی آنا ہے وہ آہستہ آہستہ بتدریج آئے گی۔ ڈھاکہ شہر کے باسی ڈھکیّہ بھی تو آج تک مکمل طور پر تبدیل نہیں ہو سکے۔ لگ بھگ سو سال کا عرصہ گزار نے کے باوجود وہ لوگ ابھی تک اپنے گھروں میں بگڑی ہوئی اُردو بولتے ہیں۔ اور پھر ادغام غیر فطری طریقے اور جبر سے ہو بھی نہیں سکتا۔ اس کو تو غیر محسوس طور پر آہستہ آہستہ مکمل ہونے میں مدتوں کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ اپنی شناخت ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے۔ اور شاید شناخت کو قائم رکھنے کے لیے ہی ہجرت عمل میں آئی تھی۔ اس وقت کے احساسات کچھ اور تھے اس وقت جذبات میں مذہبیت رچی ہوئی تھی لیکن زمین اور اس کے تہذیبی رشتوں کے آگے مذہب کی ڈور کمزور ثابت ہوئی۔ اب کیا ہوگا، اب کیا کرنا چاہیے؟ وہ الجھتا چلا جاتا۔

۷۱ء کے دسمبر میں جب بنگلہ دیش وجود میں آیا تو اس پر ایک نئی بپتا پڑی۔ بے شمار خانماں برباددوں کی طرح وہ بھی جان بچانے کی خاطر کونے کھدرے تلاش کرتا رہا۔ کچھ وقت گزرا تو نئے نئے مصائب نئے نئے کرب سامنے تھے جس آفس میں کام کرتا تھا اس کا سائن بورڈ ہی بدل گیا تھا پتہ نہیں مالکان کا کیا حشر ہوا؟
معاشی تنگی نے اسے بدحال کر دیا۔ کہیں ملازمت ملنے کا سوال ہی نہیں تھا۔

موجودہ رائج زبان سے نابلد اپنی شناخت کا سائن بورڈ اپنے چہرے پہ چپکائے وہ در در بھٹکتا رہا اور جب فاقہ کشی حد سے بڑھی تو پیٹ کے جہنم نے اس کے وقار اور انا کو نگل لیا تو وہ فٹ پاتھ پر کیلے فروخت کرنے بیٹھ گیا۔

وہ خوف زدہ اور سراسیمہ اپنی سوچوں میں گم رہتا۔ یہ کیسی بھول ہے جس کا تسلسل ہی نہیں ٹوٹتا۔ اب کیا ہوگا۔ مجھے اب کیا کرنا چاہیے۔؟

ملکوں میں جب انقلاب آتا ہے تو اُلٹ پلٹ بھی ہوتی ہے۔ مدوجزر پیدا ہوتا ہے۔ اُتھل پتھل ہوتی ہے۔ بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور اسی تبدیلی نے کیلے کے ایک معمولی سے آڑھتی کو امپورٹر بنا دیا۔ اس کا کاروبار پھیل گیا۔ اسے پھلوں کے امپورٹ کے لیے ایک لکھے پڑھے شخص کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے نور محمد کو ملازمت دے دی۔

کچھ سکھ کا سانس ملا تو نور محمد کو بچے کی تعلیم کی فکر لاحق ہوئی اُس نے اُسے اسکول میں داخل کرا دیا۔

اور جب نور محمد کی زندگی کا ڈھرہ چل نکلا تو پرانے جراثیم پھر کلبلائے۔ اس کو مشاعروں کی یاد آئی، ادبی نشستوں کی یاد آئی۔

پُرانے یار دوست بکھر چکے تھے۔ کچھ مرکھپ گئے تھے۔ کچھ پاکستان یا واپس ہندوستان فرار ہو چکے تھے باقی جو تھے انھیں جمع کیا۔ نئی ادبی انجمن بنائی۔ ماحول کی سازگاری کے ساتھ ساتھ حوصلہ بھی بڑھا۔

اب بنگلہ دیش میں اُردو کے فروغ کے لیے باتیں ہونے لگیں۔ دو ایک رسالے بھی نکالے گئے۔ آپسی اختلافات بھی سامنے آئے۔ کچھ نئی انجمنیں بھی وجود میں آئیں اور اُردو کا لنگڑا لولا ادبی کارواں چل نکلا۔

حلقۂ فکر و ادب نے ایک تقریب جشن عزیمت کے نام سے نور محمد کے ساتھ منانے کا اہتمام کیا۔ جس میں نور محمد کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے کہا گیا کہ نور محمد کی شخصیت تاریخ ساز شخصیت ہے۔ حالات کی سنگینی اور بے پناہ مصائب سے نڈھال ہو کر

جب ہم حوصلے کھو چکے تھے تو نور محمد آگے آئے اور اُردو کی بقا کی خاطر انھوں نے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک چراغ روشن کیا۔ گو کہ اس شب دیجور کی پہنائیوں کے سامنے یہ دیپ بہت کمزور ہے، پھر بھی اس کی روشنی میں ہم کم از کم خود کو شناخت تو کر سکتے ہیں۔ تحسین و آفریں کے نعروں کے ساتھ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

ستائش و سربلندی کے نشہ میں سرشار نور محمد گھر واپس آیا تو بیوی نے ایک خط دیا جو کہ اس کے بیٹے کا تھا اور چیٹا گانگ سے آیا تھا۔ جہاں اس کا بیٹا ملازمت کر رہا تھا۔

آج کئی روز سے نور محمد پریشان تھا کیوں کہ چیٹا گانگ میں سیاسی فسادات ہو رہے تھے۔ نور محمد نے بے چینی سے خط کھولا اور ایک حسرت بھری نظر تحریر پر ڈالی۔ کیوں کہ خط کی تحریر بنگلہ تھی اور وہ بنگلہ زبان سے ناواقف۔ رات زیادہ گزر چکی تھی۔ اب بنگلہ داں وہ اس وقت کہاں تلاش کرے۔ خیال کیا خط صبح پڑھواؤں گا۔ نہیں..... نہیں پتہ نہیں خط میں کیا لکھا ہے۔ اکلوتے بیٹے کی محبت نے جوش مارا اور وہ ہر قسم کے لحاظ کو بالائے طاق رکھ کر اپنے پڑوسی کے گھر کی جانب بڑھا۔

دروازہ کھٹکھٹانے پر سویا ہوا پڑوسی آنکھیں ملتے ملتے باہر آیا اور سوال کیا کی بے پار (کیا بات ہے) ؟

نور محمد نے جھٹ خط والا ہاتھ آگے بڑھا دیا امار چیٹھی ٹا پوڑھیے دین (میرا خط پڑھ دیجیے)

پڑوسی کی سوتی ہوئی آنکھیں مارے حیرت اور غصے کے باہر اُبل پڑیں.... کی ؟ (کیا ؟)

ساوتری

ٹرین ہانپتی کانپتی اپنی پوری قوت کے ساتھ دوڑی جا رہی تھی۔ ریلوے لائن سے کچھ دور سامنے کھڑے درخت آگے پیچھے بھاگتے ہوئے ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی درخت اپنی قطار سے علیحدہ ریلوے لائن کے قریب ہوتا تو وہ ہوا کے جھکڑوں سے جھوم جھوم کر اپنے بازو یوں ہلاتا جیسے کوئی بچہ ریل کو آتا دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجا رہا ہو۔ دور ہرے ہرے دھان کے کھیت چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں گھوم رہے تھے۔

میں بچپن سے ہی ریل کے سفر میں جنگلوں کے مناظر کا شیدائی رہا ہوں۔ ہمیشہ کھڑکی کے پاس ہی بیٹھنا پسند کرتا ہوں اور آج بھی کھڑکی کی سلاخوں پر اپنا سر ٹیکے ان مناظر کی دلکشی میں خود کو محو کر دینا چاہ رہا تھا۔

لیکن میری نگاہیں بار بار گھوم کر ڈبے کے اندر پلٹ آتیں جہاں کا منظر کچھ زیادہ ہی دل آویز تھا۔

میرے سامنے والی برتھ پر ایک جوان رعنا بیٹھی ہوئی تھی جس پر اچٹتی ہوئی نظر بھی پڑے تو احساس میں گدگدی نظر آنے لگے۔ چہ جائیکہ وہ ناظورۂ چمن میرے مدمقابل تھی۔ اس کے قریب ادھیڑ عمر کی ایک اور خاتون بیٹھی تھیں۔ غالباً دونوں ماں بیٹی ہوں گی۔ مجھے ماں سے کیا لینا میری نگاہوں کا مرکز تو وہ مہ پارہ تھی جس کے حسن اور میک اپ کی دلکشی سے مجھ جیسے شریف الطبع اور متین انسان کے جذبات بھی متزلزل ہو

رہے تھے۔

میری دُزدیدہ نگاہیں اس دشمنِ ایماں کے سراپے کا طواف کررہی ہوتیں کہ وہ کافرہ ایک ادا سے کسمسا کر مجھے تکنے لگتی۔ نگاہوں کا تصادم ہوتا اور اپنی فطرت سے مجبور ہوکر میری نظریں جھکتی چلی جاتیں۔ میں دل ہی دل میں لاحول پڑھتا ہوا کھڑکی کے باہر دیکھنے لگتا۔

کچھ ہی دیر میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے بجلی کے کھمبوں سے مجھے اکتاہٹ ہونے لگتی اور خودکار انداز میں میری گردن گھوم جاتی پھر اسی انداز کا نظروں کا ٹکراؤ ہوتا اور میری غیرت پشیمان ہوجاتی۔ آخر کار پریشان ہوکر میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور دیوار سے اپنی پشت لگاکر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ دوڑتی ہوئی ٹرین کے مدھم مدھم جھکولے مجھے تھپکیاں دینے لگے۔ ابھی میری نگاہوں میں غنودگی کا گزر کچھ ہوا ہی تھا! کہ بار بار پہلو بدلنے کی سرسراہٹ اور جسمِ انسانی کی لطیف سی کسمساہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ وہ دلربا انتہائی ہوشربا انداز میں مُسکرائی۔

میرے ہونٹوں پر بھی تبسم پھیل گیا۔ بے اختیار میرے لب گنگنائے۔ رنگینیاں سمٹ کر انسان ہوگئی ہیں۔ یقیناً وہ اسی قسم کی واردات قلبی ہوگی جس نے جوش سے جنگل کی شہزادی کہلوادی۔

چہرے پہ رنگ تمکیں، آنکھوں میں بیقراری، سکتہ بٹھانے والی اُٹھتی ہوئی جوانی، گلشن فروغ کمسن مخمور سہ پارہ۔ اے زمزموں کی دیوی اتنی خموشی کیوں ہے۔ تیرے پجاریوں میں میرا بھی نام ہوتا۔ مصورِ جذبات کی نظم کے مختلف مصرعے میرے حافظے میں اپنا سر اُبھارنے لگے۔ لاحول ولاقوۃ...... یہ کیا بیہودگی ہے؟ میں نے محسوس کیا نظم کو یاد کرنے کی کوشش میں میری نگاہیں لاشعوری طور پر اس غارت گرِ تحمل پر جم کر رہ گئی ہیں میں نے اپنی نظروں کے ارتکاز کو ہٹایا اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

باہر کے مناظر میں دل نہیں لگا تو میں نے کتاب نکال کر مطالعہ شروع کردیا۔ یہ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کا ایک کیبن تھا۔ تین تین نشستوں کے لیے آمنے سامنے

برتھ تھیں۔ میں اپنی برتھ پر اکیلا تھا اور میرے سامنے کی برتھ پر وہ دونوں بیٹھی تھیں۔ میں غور کرنے لگا شاید تنہائی کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے ۔۔۔ لیکن تنہائی یا رعنائی تو میرے خیال کو متزلزل نہیں کر سکتی تھی ۔۔۔۔ کچھ ایسی بات ضرور ہے کہ میرا خیال بار بار اُدھر جا رہا ہے ۔

ادھیڑ عمر کی خاتون سفید ساری میں ملبوس تھیں ۔ انھوں نے نہایت سلیقے سے ہلکا میک اپ کیا ہوا تھا ۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک بھی تھی لیکن نیچرل کلر کی ۔ وہ اونگھ رہی تھیں ۔ ٹرین کے ہچکولوں سے ان کا سر غیر متوازن ہو کر آگے پیچھے ہل رہا تھا ۔ کبھی کبھی ان کے سر کو زوردار جھٹکا لگتا تو وہ چونک کر آنکھیں کھول دیتی اور گھبرا کر نزدیک بیٹھی لڑکی کو یوں دیکھتیں جیسے وہ اس کی موجودگی کا یقین کرنا چاہتی ہوں پھر دوسرے ہی لمحے ان کی آنکھوں میں اطمینان لہریں لینے لگتا اور وہ میری جانب نظریں اُٹھا دیتیں ۔ مجھے مطالعہ میں محو دیکھ کر پھر آنکھیں موند لیتیں ۔

وہ دشمن جاں حسینہ اپنے اسٹائل سے لکھی پڑھی اور کافی ماڈرن معلوم ہوتی تھی پھر بھی وہ اپنی ساری کو سر سے پاؤں تک لپیٹے ہاتھ میں آنچل کو دابے یوں بیٹھی تھی جیسے اس نے ساری کے اندر بلی کو چھپا رکھا ہے جو ذرا موقع ملتے ہی نکل بھاگے گی ۔ میری نظریں اس دوشیزہ سے ٹکرائیں تو محسوس ہوتا اس کی نگاہیں مسکراہٹ کے پردے میں کچھ کہہ رہی ہیں ۔ میں اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتا تو لمحہ بھر میں اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری اور سپاٹ نظر آنے لگتا ۔ مجھے الجھن ہونے لگی یہ کیسی رغبت ہے ؟ جس پر بے اعتنائی کے پردے پڑے ہوئے ہیں ۔ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

اچانک ٹرین کے بریک چرچرائے اور ایک زبردست جھٹکے سے دوڑتی ہوئی ٹرین کچھ دور رینگ کر تھم گئی ۔ غالباً کوئی ایکسڈنٹ ہوا تھا اس جھٹکے سے جہاں میں سیٹ سے نیچے آتے آتے بچا تھا وہیں وہ حسینہ بھی منہ کے بل گرتے گرتے بچی تھی ۔ اس کی ساری کا آنچل نیچے آ گرا تھا اور اس کے اندر سے قیامت خیزیاں طلوع ہو رہی تھیں ۔ اس نے نہایت کھلے گریبان کا بلاؤز پہن رکھا تھا ۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے اس کی لاپرواہی کو محسوس کیا وہ اپنے لٹکتے آنچل سے بے خبر کھڑکی سے باہر مسلسل جھانک رہی تھی پھر وہ نہایت اطمینان سے کھڑکی کی سلاخوں سے ٹیک لگا کر دراز ہو گئی۔

اور پھر مجھ سے نگاہیں چار ہوتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے اُسے کچھ یاد آ گیا ہو وہ تڑپ کر اٹھی۔ اپنی ساری کو سب طرف سے ٹھیک کیا اور گویا بتی کے بچوں کو دبوچ کر بیٹھ گئی۔

نہ جانے کیوں مجھے یہ سب غیر فطری سا لگا۔ جب اتنی ہی شریف الطبع ہو میم صاحب تو پھر یہ حیا سوز گریبان کس حکیم نے نسخے میں لکھا ہے۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میری سوچ کا دائرہ پھر اسی بلاخیز کی جانب ملتفت ہو گیا اپنے آنچل کو درست کرنے میں اس نے قصداً تاخیر کی تھی اور اس دوران وہ کن انکھیوں سے میری حالت زار کا بھی معائنہ کرتی رہی تھی اور اب پھر حیا کا پیکر بنی نہایت متین انداز میں بیگانی بنی بیٹھی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

میں سوچتا رہ گیا کیا یہ بھی لبھانے کا انداز ہو سکتا ہے یا پھر عورت کی فطرت کا تقاضہ ہے کہ وہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی مقام پر نمائش پسند ہو جاتی ہے۔

مگر میرا اس سے واسطہ کیا یہ حسینہ مجھے رجھانے کیوں لگی۔ دراصل یہ مرد کی فطرت ہے کہ جہاں کسی لڑکی نے مسکرا کر دیکھا اس کے دل نے نعرہ مارا وہ پھنسی!

ایک بار پھر میں نے اپنے ذہن سے ان سب واہیات خیالات کو جھٹکا اور اپنے منہ سے کتاب لگا لی۔

کچھ ہی دیر بعد بیرا ناشتے کی ٹرے لے کر آ گیا اور وہ ناشتہ سرو کرنے لگا میں نے بیرے کو اشارہ کیا کہ میری چائے میز پر رکھ دے اور خود اوپر کی برتھ پر رکھے بریف کیس سے پیسے نکالنے کے لیے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی میں نے اپنا بریف کیس کھولا ہی تھا کہ اچانک مجھے اپنی پشت پر گرم گرم سیال کے گرنے کا احساس ہوا۔ اسی اثنا میں بائیں بازو پر لطیف سا بوجھ آ پڑا ساتھ ہی پرفیوم کی تیزی نسوانی جسم سے اٹھتی ہوئی مست مہک میں شامل ہو کر میرے حواس سے ٹکرائی تو میں نے گھبرا کر دیکھا وہ چمن آرا کسی حد تک مجھ پر لدی ہوئی اپنے توازن

کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی جس کی تمام چائے مجھ پر اُلٹ چکی تھی۔

اس سے قبل کہ میں کچھ شکایت کروں وہ بیرے پر برس پڑی۔ "اتنی دور سے ہاتھ بڑھا کر چائے دینے کی کیا تُک تھی؟"

"مم ...... مم .... میم صاحب" وہ ہکلایا "میرا کیا قصور ہے آپ ہی تو خود کو نہ سنبھال سکیں۔"

"چپ رہو بدتمیز۔"

میں نے دخل در معقولات کی "جانے دیجیے جو ہونا تھا ہوگیا۔"

دراز عمر خاتون نے مداخلت کرتے ہوئے مجھ سے کہا "آپ کی شرٹ سفید ہے جلدی اُتار کر اس کو دھونے دیجیے ورنہ دھبہ بیٹھ جائے گا۔"

میں نے ان کی بات پر عمل کرتے ہوئے قمیص اُتار کر بیرے کے حوالے کر دی۔

کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا وہ آفت جوالہ مجھے شوخ نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ گویا کہہ رہی ہو، "کہیے" کپڑے اُتروا دیے نا ..."

میں مسکین صورت بنائے اپنی شرٹ کا انتظار کرتا رہا۔

اس خاتون نے سلسلۂ کلام شروع کرتے ہوئے مجھ سے کہا "آپ کی نئی شرٹ خراب ہوگئی۔"

"نہیں شرٹ نئی تو نہیں تھی۔" میں نے جواباً کہا

وہ مسکرا کر بولیں "آدمی جب باہر نکلتا ہے تو اچھے کپڑے ہی پہن کر نکلتا ہے۔

"ہاں یہ تو ہے۔" میں نے تائید کی۔

وہ پھر گویا ہوئیں "آپ رہتے کہاں ہیں؟"

"ڈھاکہ" میرا مختصر سا جواب تھا۔

"ارے ہم بھی تو ڈھاکے میں ہی رہتے ہیں۔ آپ کرتے کیا ہیں؟" وہ خاتون بے تکلفی پر اُتر آئیں۔

"میرا امپورٹ کا بزنس ہے۔"

"اور ہو آپ بزنس کرتے ہیں ہمارے تو ڈھاکہ شہر میں دو مکان ہیں کرایہ آتا ہے کبھی ہمارے یہاں بھی آئیے۔" یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنے پرس سے ایک کارڈ پر اچٹتی سی نظر ڈالی اس پر مسز اسلام درج تھا میں نے شکریہ کے ساتھ کارڈ لے کر رکھ لیا۔

اب ٹرین نے اپنی رفتار کم کر کے رینگنا شروع کر دیا تھا کومِلا کا اسٹیشن آگیا تھا۔

گاڑی رُکتے ہی طرح طرح کا شور سُنائی دینے لگا۔ لوگ اپنے اپنے تھیلے سوٹ کیس اور بیگ سنبھالے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ ہم سب اس بھاگم بھاگ کا نظارہ دلچسپی سے کر ہی رہے تھے کہ ایک اسٹوڈنٹ ٹائپ کا لڑکا ہماری کھڑکی کے پاس آکر رُکا اور اس نے بھرپور نظروں سے اس حسینہ کا جائزہ لیا پھر ایک زوردار سیٹی بجاتے ہوئے وہ چیخا۔

"ارے ادھر آؤ وہاں کہاں گھوم رہے ہو۔"

اس کی آواز پر نوجوان لڑکوں کا ایک غول ہمارے کمپارٹمنٹ کے سامنے آکر رُکا۔ وہ سب کھڑکی کے اندر جھانک جھانک کر سیٹیاں بجانے لگے۔

وہ محترمہ بولیں "توبہ! کیسا بُرا وقت آگیا ہے۔ بیٹی تم کھڑکی کے پاس سے ہٹ جاؤ" لڑکی نے اُٹھ کر اپنی ماں سے سیٹ تبدیل کر لی۔

مجھے بھی اس نوجوان کی ذہنیت پر بہت افسوس ہو۔ ہمارے نوجوانوں کی یہ کیسی تربیت ہو رہی ہے آگے جا کر اُن کا کیا حال ہوگا۔

ٹرین کی روانگی کا وقت ہوگیا تھا۔ انجن کے سیٹی دیتے ہی وہ سب دھڑ دھڑاتے ہوئے ہمارے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوگئے۔ وہ آٹھ لڑکے چھ نشستوں والی دو برتھوں پر کسی نہ کسی طرح لد گئے جب کہ ہم تین مسافر پہلے سے ہی موجود تھے۔

کچھ ہی دیر میں وہ شرارت پر اُتر آئے۔ انھوں نے اپنا بوجھ ان دونوں ماں بیٹی پر ڈالنا شروع کر دیا۔ ان کے دباؤ سے پریشان ہو کر وہ شوخ نگاہیں جو کچھ دیر پہلے سے کھلواڑ کر رہی تھیں اب سہم کر مدد کی اپیل کرنے لگیں۔

کچھ دیر توقف کے بعد میں ان لڑکوں سے مخاطب ہوا "آپ کو معلوم ہے یہ ریزرو سیٹ ہے؟"

کیا صرف آپ کے لیے ہم کیا دیکھ بھی نہیں سکتے؟" ایک نے جواب دیا۔

میرا خون کھول کر رہ گیا۔ میں غصے میں بھنا کر درشت لہجے میں بولا "یہ فرسٹ کلاس ہے ٹکٹ ہے آپ کے پاس؟"

"ہم ٹکٹ لیتے نہیں دیتے ہیں آپ کو ٹکٹ اوپر کا چاہیے یا نیچے کا؟" اس نے زمین کے نیچے کا اشارہ کیا۔

یہ صریحاً دھمکی تھی۔ میں تلملا کر رہ گیا اور پیچ و تاب کھاتا ہوا کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا پھر اٹھ کر زنجیر کی جانب بڑھا۔

وہ لڑکا بولا "شوق سے چین کھینچیے مگر خیال رہے ہمیں جرمانہ دینے کی عادت نہیں ہے گارڈ آپ کو پکڑے گا ہم تو صرف بیٹھے ہوئے ہیں کسی کو اٹھا کر نہیں لے جا رہے ہیں"

بات شاید معقول تھی۔ میرا زنجیر کی جانب بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا۔ اتنے میں ایک لڑکا میری خالی کی ہوئی جگہ پر بیٹھ گیا۔ ان کے ارادے نیک نہیں تھے۔ وہ ہاتھا پائی بھی کر سکتے تھے۔ میں برافروختہ خاموش کھڑا رہا۔ مجھے دیکھ دیکھ کر وہ لڑکے مسکراتے رہے۔

جب مجھے کھڑے ہوئے کافی دیر ہو گئی تو اس خاتون کو خیال آیا۔ انھوں نے اپنی بیٹی کو سمٹ جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی کسی حد تک سمٹ گئیں۔

میں کھڑکی کے نزدیک کسی نہ کسی طرح ٹک گیا۔ ہم سب اس بری طرح پھنسے ہوئے بیٹھے تھے کہ وہ حرافہ ہوا سے اڑتی ہوئی اپنی زلفیں درست کرتی تو اس کا ہاتھ میرے بال بھی سنوار دیتا۔ اب وہ کمبخت میرے اوپر لدی جا رہی تھی۔ بجائے اس کے کہ میں اس کے گداز جسم کی لذت سے محظوظ ہوتا غصہ سے میرا پارہ چڑھنے لگا۔ کچھ دیر تک تو میں برداشت کرتا رہا پھر اٹھ کر کیبن کے باہر نکل گیا اور باہر کا دروازہ کھول کر اندھیرے میں اڑتے ہوئے جگنو تلاش کرنے لگا۔

ڈھاکہ شہر کے آثار قریب آچکے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے روشنیاں ایک دوسرے کے آگے پیچھے دوڑنے لگیں۔ ٹرین دھڑادھڑ پٹریاں بدلتی شور مچاتی پلیٹ فارم کو چھو رہی تھی۔ گاڑی رکتے ہی میں بغیر کسی دعا سلام کے ٹرین سے اتر آیا۔

یہ تقریباً ایک ماہ بعد کی بات ہے میرا دوست متان چٹاگانگ سے ڈھاکہ آیا۔ شام کو اس نے اپنی پرانی خواہش کا اظہار کیا کہ چلو چائنیز چلتے ہیں۔ وہ جب بھی... ڈھاکہ آتا ہے رات کا کھانا چائنیز میں ہی کھاتا ہے اور رات گئے تک مارا مارا پھرتا رہتا ہے

آج کھانے سے فارغ ہو کر اُسے نہ جانے کیا سوجھی میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا چلو کچھ تفریح ہو جائے۔

میں نے دریافت کیا کیسی تفریح چاہتے ہو؟

"ایسی تفریح جو تمھارے بس کی بات نہیں ہے پینے پلانے کی کچھ موج منانے کی ہو میں نے بُرا سا منہ بنایا "تم جانتے ہی ہو ان خرافات سے مجھے دلچسپی نہیں ہے۔"

وہ ہنس کر بولا "اچھا پارسا صاحب آپ حصّہ مت لیجیے گا۔ میں آپ کے شہر میں دو روز کے لیے مہمان ہوں آپ مجھے کیوں محروم رکھتے ہیں۔"

میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے ساتھ چلنے کی حامی بھرلی۔

اس نے ایک رکشے والے سے کچھ بات کی اور رکشے پر چڑھ کر مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

رکشہ جب دھان منڈی کے علاقے میں داخل ہوا تو میں نے حیرت ظاہر کی "یہ تو رہائشی علاقہ ہے۔ وہ بھی بڑے لوگوں کا۔ یہاں کہاں جا رہے ہو؟"

متان نے مجھے مسکرا کر دیکھا اور بولا "بیٹھے رہو۔"

کچھ دیر بعد رکشہ ایک بنگلہ نما مکان کے سامنے جا کر رُک گیا جس کے گیٹ کے دونوں جانب خوشنما لیمپ روشن تھے۔ ایک بڑی بڑی مونچھوں والے قوی ہیکل دربان نے ہم سے دریافت کیا "کس سے ملنا ہے؟"

جواب میں متان نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک وزیٹنگ کارڈ دربان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

دربان نے کارڈ لیتے ہی دروازے کے اندرونی جانب لگے ہوئے ایک پُش بٹن پر اپنی انگلی رکھ دی۔

اس کارڈ پر نظر پڑتے ہی مجھے الجھن ہونے لگی۔ یہ کارڈ منان کا تو نہیں ہے پھر بھی وہ کارڈ مجھے جانا پہچانا سا لگا۔ دن میں بجانے کتنے کارڈ نظروں سے گزرتے رہتے ہیں۔ ہوگا کسی کا یہ سوچ کر میں نے اپنے ذہن کو جھٹک دیا۔

اسی اثنا پورٹیکو روشن ہوگیا۔ دربان نے ہمیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ہم ایک ملازمہ کی معیت میں ڈرائنگ روم میں جاکر بیٹھ گئے۔

ڈرائنگ روم نہایت سلیقے اور نفاست سے آراستہ کیا ہوا تھا۔ پھولدار قالین کا فرش اور آمنے سامنے خوبصورت صوفے رکھے تھے۔ درمیان کی تپائی پر سفید پتھر کا ایک ہاتھی سونڈ اُٹھائے کھڑا تھا۔ کمرے کے کونوں میں چھوٹے بڑے مختلف قسم کے پودے رکھے ہوئے تھے۔ دو جانب اسٹینڈ پر شیڈ والے لیمپ جل رہے تھے جن سے روشنی چھن چھن کر آرہی تھی

ابھی میں ماحول کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ سامنے کے دروازے سے چاند طلوع ہوتا دکھلائی دیا۔

میں بوکھلا کر کھڑا ہوگیا۔ وہی ٹرین والی سیم تن قتالہ مُسکراتی ہوئی ہماری جانب بڑھتی رہی۔

مہین سفید ساری میں اس نے نہایت مختصر کالے رنگ کا بلاؤز پہن رکھا تھا جس میں سے سرکش چٹانیں جھانک رہی تھیں۔ میں نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں ہی تھیں کہ ایک اور دھچکے سے میرا ذہن ہچکولے کھاتا ہوا حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوگیا کیوں کہ وہ محترمہ ممی بھی مزید تین حسیناؤں کے ساتھ کمرے میں داخل ہورہی تھیں۔

اوہ اب یاد آیا وہ وزیٹنگ کارڈ مجھے جانا پہچانا کیوں لگا تھا۔

اس سے قبل کہ میں لب کشائی کروں منان نے آگے بڑھ کر مسز اسلام کا خیر مقدم کیا محترمہ کی نظر جیسے ہی مجھ پر پڑی وہ چونکیں ”اوہو آپ بھی آئے ہیں؟“

منان نے حیرت ظاہر کی ”آپ انھیں جانتی ہیں؟“

بولیں ”ہاں کیوں نہیں چیٹگاؤں سے آتے وقت ٹرین میں ان سے ملاقات رہی تھی“

منان نے قہقہہ لگایا... ”میں کچھ اور سمجھا تھا“

پھر منان مسز اسلام کو علیحدہ لے جا کر اُن سے کھُسر پُھسر کرنے لگا تو میں نے دل ہی دل میں کہا "خوب پھنسے ہو کہاں یہ بارگاہِ ناز اور کہاں تم!"

میں نے پھر ایک بار اُن حسیناؤں کا جائزہ لیا۔ وہ قطار میں اس طرح کھڑی تھیں جیسے عالمی حسن کا مقابلہ ہو رہا ہو۔ غیر ارادی طور پر میری نگاہیں ان کو نمبر دینے کے لیے ناپ تول کرنے لگیں۔

اتنے میں منان نے ٹرین والی ساوتری کی جانب اشارہ کیا محترمہ ممی نے جواب میں آہستہ سے کچھ کہا۔ دونوں کے درمیان مختصر سی گفتگو ہوئی۔

پھر منان ان کی کسی بات پر حامی بھر کر گردن ہلاتا ہوا میرے نزدیک آکر بولا

"اس وقت تمھارے پاس دو ہزار ٹکے ہوں گے؟"

میں نے غصیلی نظروں سے اسے دیکھا اور چپ چاپ اپنا پرس نکال کر اس کے حوالے کرتے ہوئے خود باہر نکلا چلا آیا۔ وہ آوازیں دیتا ہی رہ گیا میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

مُرغ پلاؤ

"او..... ماں......!" بلقیس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ اُچھل کر فٹ پاتھ پر جا چڑھی۔

نزدیک ہی کھڑی چمپا جو فٹ پاتھ پر فروخت ہو رہے سینڈلوں کا حسرت سے معائنہ کر رہی تھی۔ بلقیس کی آواز سن کر چونکی اور اس نے دریافت کیا۔ "کیا ہوا؟" فوراً ہی ماجرا اس کی سمجھ میں آ گیا۔ کیوں کہ بلقیس کی حیرت زدہ نگاہیں جاتی ہوئی ایک ڈبل ڈیکر بس پر مرکوز تھیں جو ابھی ابھی فٹ پاتھ سے لگ کر گزری تھی۔ اُس نے بلقیس کے سر پر ہلکی سی ایک چپت رسید کی اور بولی "یہ ڈھاکہ شہر ہے یہاں بہت دیکھ بھال کر چلنا ہوگا۔"

"مگر... مگر یہ دو تلہ باڑی.....؟"

"اری پگلی! یہ دو تلہ بس ہے۔" چمپا نے اسے سمجھایا اور دوبارہ چپل دیکھنے میں محو ہو گئی۔

اب جو بلقیس کی نگاہ سامنے اُٹھی تو وہ کٹ کر رہ گئی۔ ایک آدمی سامنے کھڑا اس کی مسکی ہوئی ساڑی سے جھلکتے ہوئے بدن کو بڑی محویت سے تک رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر بدلی میں سے جھانکتے ہوئے چاند کو اوٹ میں کرنے کے لیے اپنی بوسیدہ ساڑی کو چٹکی سے پکڑ کر کھینچا تو بغیر کسی آواز کے ساڑی میں ایک اور شگاف پیدا ہو گیا۔ چاند کی جگمگاہٹ کچھ اور بڑھ گئی۔ بلقیس گھبرائی اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ شرم اور گھبراہٹ میں وہ وہیں اُکڑوں بیٹھ گئی تاکہ ہوسناک نگاہوں کے تیروں سے بچنے کے لیے زانوؤں کی ڈھال

استعمال کر سکے۔

"اب کیا ہوا؟" چمپا نے مڑکر پوچھا۔ پھر بات کو سمجھتے ہوئے اس نے بلقیس کے پلو کو اٹھا کر اس کے گرد لپیٹا اور ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولی "چل گھر چلیں" پھر بڑے پیار سے کہنے لگی "دیکھ بلقیس! کوئی دوسری ساڑی تو میرے پاس بھی نہیں ہے ورنہ میں تجھے دے دیتی۔ کچھ دن تکلیف اٹھالے بھکشا (بھیک) سے کچھ پیسے جمع ہو جائیں تو کوئی پرانی ساڑی خرید لیں گے۔"

ساڑی خریدنے کی لگن میں بلقیس نے اپنے کام میں تیزی دکھلانی شروع کر دی ورنہ بھیک مانگنے کے لیے نہ تو اس کی آواز میں رقت پیدا ہوتی اور نہ ہی اس کا ہاتھ کسی کے آگے پھیلتا تھا۔ اُسے بہت جھینپ آتی تھی مگر کیا کرتی اپنی افلاطونی جوانی سے پریشان تھی جو بوسیدہ ساڑی کی متحمل نہ ہو پا رہی تھی۔ لوگوں کی نگاہوں کے تیر برچھیوں کی طرح اس کے احساس کو برمائے دے رہے تھے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ وہ اور چمپا بھات کھانے کے لیے گھر جا رہی تھیں کہ ایک بہت ہی مسحورکن خوشبو کا جھونکا آیا۔ بلقیس نے لاشعوری طور پر ایک گہرا سانس لیا اور پھر سانس لیتی ہی چلی گئی۔ خوشبو نے اس کے حواس کو سلب کر لیا تو بے اختیار اس کا منہ اوپر اٹھ گیا۔ خفیف سے دھوئیں کے ساتھ وہ اشتہا انگیز خوشبو ایک بار پھر نتھنوں کی راہ سرسراتی ہوئی اس کے حواس سے ٹکرائی تو وہ سمت کا تعین کرنے لگی کہ خوشبو کدھر سے آ رہی ہے۔

چمپا نے جب اسے گھوڑے کی طرح منہ اوپر اٹھا کر فضا میں نتھنے پھلاتے دیکھا تو قہقہہ مار کر بولی۔

"کیا پلاؤ کی خوشبو سونگھ رہی ہے؟"

بلقیس نے مسکرا کر اثبات میں گردن ہلائی۔

"آ..... میرے ساتھ دکھلاتی ہوں....." کہہ کر اس نے بلقیس کا ہاتھ تھاما اور تیز تیز قدم بڑھاتی ایک لمبی دیوار کا چکر کاٹ کر وہ اسے ایک سلاخوں دار پھاٹک کے پاس

لے آئی جہاں اندر کی جانب کئی دیگیں چولھوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ مٹیلے دھوئیں کے ساتھ دیگوں میں سے اُٹھتی ہوئی ہلکی ہلکی بھاپ نے فضا میں ایک اشتہا انگیز خوشبو بکھیر رکھی تھی۔

سلاخوں کے پار سے بلقیس ان دیگوں کو اشتیاق بھری نظروں سے تکنے لگی۔

"بہت بڑھیا خوشبو ہے! پلاؤ کھائے گی کیا؟" چمپا نے دریافت کیا۔

بلقیس کے کانوں میں گویا جلترنگ بج اُٹھے۔ خوشی سے اس کے دانت نکل پڑے۔ اور اُس نے جلدی جلدی دوبارہ اپنی گردن اوپر نیچے کی "مگر کیسے؟ ہمیں پلاؤ کیسے ملے گا؟" اُس نے چمپا سے سوال کیا۔

"دیکھتی رہ۔ چل اُدھر کھڑی ہو جا" وہ اسے سامنے کھڑے بھکاریوں کے غول کی جانب اشارہ کر کے بولی۔

بلقیس نے دیکھا اُن دونوں کی طرح اور بھی کئی عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے کھڑے ہوئے اُن دیگوں کو دور سے تک رہے تھے۔ جن میں سے ایک مست بھاپ نکل کر فضا میں منتشر ہو رہی تھی اور سانس کے ذریعے ان کے جسموں میں داخل ہو کر ان کی انتڑیوں میں گلبلاہٹ پیدا کر رہی تھی۔

وہ اور چمپا نصف گھنٹے تک وہاں کھڑی رہیں، تب کہیں جا کر ایک آدمی سینی میں مرغ پلاؤ کی چوسی اور چچوڑی ہوئی ہڈیاں لے کر باہر آیا اور اُس نے دیوار کے ساتھ ایک کونے میں ان ہڈیوں کو ڈھیر کر دیا۔ ان چوسی اور چبائی ہوئی ہڈیوں میں چاول کے دانے جگہ جگہ چپٹے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کھانے والوں کے سامنے پلاؤ افراط سے رکھا تھا تب ہی انھوں نے انتہائی غفلت اور بے پروائی سے کھایا ہے۔

وہ آدمی اپنی پرات جھاڑ کر جیسے ہی ہٹا، بھکاریوں کا غول اس چھوٹی سی ڈھیری پر چیل کوؤں کی طرح ٹوٹ پڑا اور آناً فاناً ان ہڈیوں کی تکابوٹی ہو گئی۔ کسی کے حصے میں دس، کسی کے بیس تو کسی کے حصے میں چار پانچ ہی ہڈیاں آئیں۔ وہ سب اپنی اپنی قسمت کے حاصل کو سمیٹ کر آپس میں گالم گلوچ کرتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔

چمپا اور بلقیس نے اپنے اپنے حاصل ایک جگہ جمع کر لیے، گھر پہنچ کر چولھا سلگایا

اور اُن ہڈیوں میں نمک لگا کر پانی ڈالا اور بھات کی پتیلی میں ڈال کر چولھے پر چڑھا دیا۔ کچھ ہی دیر میں مفلسی پلاؤ تیار ہو گیا۔

دونوں کی اشتہا تو پہلے ہی سے چمکی ہوئی تھی آن کی آن میں پوری پتیلی صاف ہو گئی۔

پانی پینے کے بعد چمپا نے بلقیس سے دریافت کیا "تو نے کبھی اصلی مُرغ پلاؤ کھایا ہے؟"

جواب میں بلقیس نے نفی میں گردن ہلائی تو چمپا نے چٹخارہ لیتے ہوئے کہا۔

"کھائے گی تو مزہ آجائے گا۔"

"سچ.....؟" بلقیس نے چمپا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا "تو کھلواؤ نا؟"

چمپا بولی "اصل پلاؤ قسمت سے کبھی کبھار ہی ملتا ہے۔ ان لوگوں میں جب کوئی مرجاتا ہے تو کبھی کبھی کوئی بڑا آدمی ہم بھکاریوں میں مُرغ پلاؤ بھی بانٹ دیتا ہے۔"

دوسرے روز رات کو وہ دونوں بھیک مانگ کر واپس ہو رہی تھیں کہ راستے میں کمیونٹی سینٹر کا دروازہ کھُلا ہوا دیکھ کر چمپا رک گئی۔ اُس نے گردن لمبی کر کے اندر جھانکا اندر سناٹا پڑا ہوا تھا۔ اپنے پیچھے بلقیس کو آنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ اندر داخل ہو گئی۔ کچھ ہی دور پر چولھے جل رہے تھے اور ان پر دیگیں رکھی ہوئی تھیں۔ برآمدے میں دو باورچی بیٹھے پیاز چھیل رہے تھے اور ایک آدمی بیٹھا ان سے باتیں کر رہا تھا۔

ان دونوں کو دیکھ کر وہ چونکے۔ ایک باورچی نے ان سے درشت لہجے میں سوال کیا "کیا ہے؟ کیوں آئی ہو؟"

چمپا نے ڈری ڈری آواز میں کہا "کچھ کھانا ملے گا؟"

وہ آدمی پھر کرخت آواز میں بولا "جا، جا یہاں سے کھانا وانا یہاں نہیں ہے۔"

اس سے قبل کہ چمپا مزید خوشامد کرے۔ نزدیک بیٹھا دوسرا آدمی تڑپ کر بولا۔

"ابے چپ رہ مجھے بات کرنے دے۔" اُس نے اشارے سے دونوں کو قریب بلایا۔ اور ایک گہری نظر اُن کے سراپے پر ڈالتے ہوئے بڑی نرمی سے بولا۔ "کھانا صبح تک تیار ہو گا کیا تم رات کو یہاں رہ سکو گی؟"

چمپا نے نفی میں گردن ہلائی۔ پھر یہ سوچ کر کہ یہ آدمی نرمی سے بات کر رہا ہے اس کی ہمت بندھی اور اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر دریافت کیا "ان پتیلیوں میں کیا ہے؟"

وہ ہنسا اور بولا "پگلی ان میں پانی گرم ہو رہا ہے۔"

"ویسے ہمارے حصّے کا دوپہر کا مرغ پلاؤ رکھا ہوا ہے تمھیں ایک گھنٹہ رکنا ہوگا۔ کیوں کہ پلاؤ اُدھر کمرے میں بند ہے۔ کمرے کی چابی استاد کے پاس ہے۔ وہ باہر گیا ہے گھنٹہ آدھا گھنٹہ میں آجائے گا۔"

وہ آدمی بات تو چمپا سے کر رہا تھا مگر اس کی نظریں بار بار بلقیس کے جسم کو ٹٹول رہی تھیں۔ جیسے کوئی قصائی سودا کرتے وقت راس کی جانچ کر رہا ہو۔ پھر وہ چمپا سے مخاطب ہوا "جب تک تو ہمارا کچھ کام کر دے۔ وہ سامنے جھاڑو رکھا ہے ذرا آنگن میں جھاڑو لگا دے۔"

چمپا نے جھاڑو اٹھا لیا اور بلقیس ایک کونے میں بیٹھ گئی۔

چند ہی لمحوں بعد وہ آدمی بلقیس سے مخاطب ہوا۔ "تو بیکار کیوں بیٹھی ہے کیا تجھے پلاؤ نہیں کھانا ہے؟ چل تو چل کے اُدھر کا کمرہ صاف کر دے۔" یہ کہتا ہوا وہ برآمدے کے آخری جانب مڑ گیا اور ایک کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے بلقیس کو اشارہ کیا "ادھر آ اس کمرے کو صاف کر۔"

بلقیس جب کمرے کے اندر پہنچی تو خوشی سے اس کی قلقاری نکل گئی۔ سامنے ٹیبل پر دو بڑی سینیوں میں مرغ پلاؤ بھرا رکھا تھا جس کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک رہا تھا۔

وہ مقناطیسی طور پر ان سینیوں کی جانب کھنچی چلی گئی۔

کھٹکے کی ایک ہلکی سی آواز پر پلٹ کر اُس نے دیکھا تو دروازہ بند ہو چکا تھا۔ سامنے ہی باورچی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ کچھ دیر تک اس کی نگاہیں بلقیس کے نشیب و فراز کو ٹٹولتی رہیں۔ پھر وہ کھنکارا۔ اور بڑے پیار سے بولا "کھالے کھالے، جتنا دل چاہے کھالے پلاؤ بہت ہے۔ ابھی کھائے گی یا بعد میں اپنی بہن کے ساتھ؟"

بلقیس کچھ بولی نہیں صرف اسے خون خوار نظروں سے گھورتی رہی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دھان کے ہرے ہرے کھیت لہرانے لگے جہاں چیئرمین کے لڑکے سلام نے

اس کا ہاتھ پکڑ کر کھیت میں کھینچا تھا تو وہ گرتے گرتے بچی تھی۔ اس نے جواب میں سلام کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ رسید کیا تھا۔ جس کی وجہ سے اُسے گاؤں چھوڑنا پڑا تھا۔ بھلا گاؤں کے چیئرمین کے لڑکے پر ہاتھ اُٹھانا آسان ہوتا ہے۔ اس کے بعد سے وہ دربدر کی ٹھوکریں کھا رہی تھی۔ غریب ماں باپ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ انھوں نے کسی نہ کسی طرح اس کو ڈھاکہ شہر چمپا کے پاس بھیج دیا تھا۔

بلقیس کو ہوش آیا تو باورچی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامے اپنے ہونٹوں سے مسل رہا تھا۔

ایک جھٹکے سے اس نے اپنا ہاتھ الگ کیا اور زناٹے دار تھپڑ کے بعد باورچی کے منہ سے خون رِسنے لگا۔ اُس کا اوپری ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ وہ خون تھوکنے کے لیے جوں ہی گھوما بلقیس اتنے میں زقند مار کر دروازے پر تھی۔ ہاتھ بڑھا کر چٹخنی گرائی اور ایک ہی چھلانگ میں وہ کمرے کے باہر تھی۔

جب تک وہ برآمدہ پار کرے، باورچی چیختا ہوا پیچھے لپکا "پکڑو پکڑو سالی بھاگی جارہی ہے۔"

دونوں باورچی اس کے پیچھے دوڑے اور وہ کسی ہرنی کی طرح چھلانگیں مارتی گیٹ تک پہنچ گئی۔

یہاں ایک اور مصیبت اس کی منتظر تھی۔ سامنے دو مسلح سنتری کھڑے نظر آئے انھوں نے ہاتھ اُٹھا کر بلقیس کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ اتنے میں باورچی بھی وہاں پہنچ گئے۔

سنتری نے دریافت کیا "کیا بات ہے؟"

باورچی ہانپتے ہوئے بولا "یہ سالی چوری کرنے آئی تھی بھاگی جارہی ہے۔"

بلقیس جو ہمیشہ سے ہی پولیس کو ہوّا سمجھتی تھی۔ بچپن سے ہی اس کی ماں اس کو پولیس کے نام سے ڈراتی آئی تھی، جب بھی وہ شرارت کرتی اس کی ماں اس سے کہتی مان جا.... ورنہ پولیس پکڑ کر لے جائے گی ___ اب سپاہیوں کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کا دم نکل گیا۔ وہ سہمی ہوئی خاموش کھڑی رہی۔ اسے اس کا بھی ہوش نہیں تھا کہ اس کی بوسیدہ ساڑی

مزید مسک گئی ہے اور سنتریوں کی نظریں ان چھوٹے روزنوں میں جھانک رہی ہیں۔

دونوں سنتریوں نے نگاہوں نگاہوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا۔ پھر ایک سنتری کڑک کر بولا "چوری کرتی ہے۔ آوارہ بدمعاش چل تھانے چل۔" یہ کہتے ہوئے اس نے بلقیس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ بلقیس کسی سہمی ہوئی بکری کی طرح بغیر منمنائے قصائی کے ساتھ ساتھ مرے مرے قدم بڑھاتی چلنے لگی۔

اسے لے جاکر ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ جہاں پر زناٹے دار تھپڑ کے جواب میں مضبوط گھونسے اور طاقتور لاتیں تھیں۔ پھر کچھ ہی دیر میں وحشی درندگی کے سامنے اس کی نسوانی مدافعت کمزور پڑ گئی۔

صبح کٹی ہاری گردن جھکائے بلقیس جب اپنی جھونپڑی میں داخل ہوئی تو وہ نزع کے سے کرب سے دوچار تھی۔ اس نے ایک سسکاری بھری اور ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں سب کچھ وہی تھا پر ہر چیز خالی خالی اور ویران سی اس کے وجود کی طرح کھوکھلی۔ جیسے اس کے اندر سے کوئی چیز نکل گئی ہو۔ اور صرف بے روح ڈھانچہ رہ گیا ہو۔

سامنے منہ سر لپیٹے چمپا سو رہی تھی۔ اس نے چمپا کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا "چمپا... او چمپا اُٹھ صبح ہو گئی ہے۔"

چمپا کسمسا کر بولی "رہنے دے ابھی تو لیٹی ہوں۔ وہاں سامنے طاق پر مرغ پلاؤ رکھا ہے، کھا لے۔"

کھانے کے نام پر بلقیس کے سُلگتے ہوئے ذہن میں احساس جاگا کہ وہ بھوکی ہے کل دوپہر سے اس نے کچھ نہیں کھایا ہے۔ بھوک سے اس کا پیٹ جل رہا ہے۔ اس نے نظر اُٹھا کر طاق کی جانب دیکھا۔ اس کی نظریں پلاؤ کی پلیٹ پر جم گئیں اور وہ کھوئی کھوئی نگاہوں سے پلیٹ کی جانب تکتی رہی۔ جہاں سے دھیمی دھیمی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے وہ مہک سرانڈ میں تبدیل ہونے لگی۔ تعفن سے اس کے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں۔ اس نے گھبرا کر اپنی ناک پر ساڑی کا پلو رکھ لیا۔

اچانک اس کے خالی پیٹ میں انتڑیاں بہت زور سے سرسرائیں تو وہ چمپا سے

لپٹ سی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

چمپا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی "کیا ہوا..... کیوں رو رہی ہے؟" اس نے گھبرا کر دریافت کیا۔

بلقیس منہ سے کچھ نہیں بولی صرف سسکیاں بھرتی رہی۔ تو چمپا مسکرائی۔

"کیا بہت بھوک لگی ہے؟ کہہ تو رہی ہوں وہاں سامنے پلاؤ رکھا ہے۔ کھالے۔ میں نے تیرے لیے ہی رکھا ہے۔"

بلقیس نے نظر بھر کر پلاؤ کی جانب دوبارہ دیکھا اور منہ اونچا کر کے حقارت سے تھوک دیا۔ پھر اپنی ساڑی کا آنچل منہ پر ڈال کر چمپا کے برابر لیٹ گئی۔

ضمیر کا زخم

دتو ہانپتا کانپتا جبار کے گھر میں داخل ہوا، اور جب اس نے یہ منحوس خبر جبار کی ماں کو سنائی کہ جبار بازار میں جیب کاٹتے ہوئے پکڑا گیا تو رحیمہ بی بی پر تو بجلی گر پڑی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دتو کو یوں تکنے لگیں گویا اس نے جبار کی گرفتاری کی نہیں بلکہ اس کی موت کی خبر سنائی ہو۔

دتو نے ان کا فق چہرہ دیکھا تو اپنی جلد بازی پر اسے افسوس ہوا اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ رحیمہ بی بی کو کس طرح دلاسہ دے۔ چند ثانیے تک وہ گھبرا گھبرا کر ان کی صورت تکتا رہا پھر اضطراری طور پر اس کی زبان چل پڑی اور وہ تفصیل بتانے لگا کہ میں اور جبار ایک اسامی کا پیچھا کر رہے تھے۔ جبار نے جوں ہی اس کی جیب پہ ہاتھ صاف کیا وہ کمبخت ہوشیار ہو گیا اور اس نے شور مچا دیا جبار معہ رقم کے پکڑا گیا۔ میں بہت مشکل سے وہاں سے بھاگ کر اپنی جان بچا پایا ہوں۔" دتو نے ایک ہی سانس میں پورا ماجرا کہہ سنایا مگر رحیمہ بی بی نے تو جیسے یہ داستان سنی ہی نہیں۔ ان کے اوسان خطا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ جبار پکڑا گیا۔ ان کے کانوں میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی جبار پکڑا گیا... دیکھتے ہی دیکھتے ان کا چہرہ زرد ہو گیا اور آنکھوں سے دھارے بہہ نکلے۔ ان کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلی اور وہ پاس پڑی چارپائی پر گر کر بین کرنے لگیں "ہائے رے میری قسمت میں نے کتنا سمجھایا کوئی دوسرا دھندہ ڈھونڈ لے کسی دن دھر لیا گیا تو کیا ہوگا۔ پر وہ میری سنتا ہی کب تھا۔ جب سے اس کے باپ گزرے ہیں ہم پر مصیبتوں پر مصیبتیں آرہی

ہیں۔ ارے تم لوگوں نے میرے بچے کو برباد کر دیا تیرے ہی ساتھ رہ کر خراب ہوا ہے۔

ماں کی چیخ و پکار سُن کر اندر کوٹھری سے نجمہ اور سلمیٰ بھی نکل آئیں اور جب ماجرا ان کی سمجھ میں آیا تو وہ بھی رونے لگیں۔

دلّو نے جب دیکھا چیخ و پکار بڑھ رہی ہے کہیں محلّے والے جمع نہ ہو جائیں تو اس کی بھی شامت آجائے۔ وہ سمجھانے کی کوشش کرنے لگا "خالہ! تم فکر نہ کرو بس دو تین مہینے کی ہی تو بات ہے۔ جبار جلدی آجائے گا۔"

یہ سُن کر رحیمہ بی بی مزید بلک گئیں "فکر...... فکر کیسے نہ کروں ہم کیا مالدار لوگ ہیں اب کھانے کو کہاں سے آئے گا؟ یہ پیٹ کی دوزخ کیسے بھرا کرے گی۔ جو کچھ بھی کرتا تھا گھر کا خرچ تو وہی چلاتا تھا۔"

دلّو نے بڑی بی کی بات اُچک لی اور جلدی سے بولا "خالہ! میری بات بھی تو سنو! آخر تم مجھے غیر کیوں سمجھتی ہو میں جو موجود ہوں۔ پھر میں استاد سے بھی بات کروں گا وہاں سے بھی تمھارے لیے کچھ خرچہ پانی ملنے کی اُمید ہے۔" دلّو نے یہ کہہ کر سلمیٰ کی جانب دیکھا اور بڑے پھکّڑپن سے مُسکرانے لگا۔

سلمیٰ نے شرماتے ہوئے مسکرا کر اپنی گردن جھکالی

آخر کار کسی نہ کسی طریقے سے لشتم پشتم گھر کا خرچ چلنے لگا۔ پچاس روپے ہفتے کی ذمہ داری اُستاد نے لے لی۔ باقی خرچ دلّو پورا کرنے لگا۔

دلّو خواہ مخواہ خرچ نہیں کر رہا تھا۔ اس کی عنایتیں سلمیٰ پر روز بروز بڑھتی جارہی تھیں رحیمہ بی بی کی تجربہ کار نگاہیں سب محسوس کر رہی تھیں وہ سوچتیں اور دل مسوس کر رہ جاتیں اگر وہ دلّو کو اپنے گھر میں آنے سے منع کر دیتیں تو خرچ کہاں سے آتا فاقے ہو جاتے۔ پیٹ کی آگ عزتِ نفس کو جھلسائے دے رہی تھی۔ مگر وہ مجبور تھیں۔ انھوں نے بیٹی کو کئی بار سمجھانے کی کوشش کی لیکن جوانی کسی کے سمجھانے کو سمجھ پاتی تو دیوانی کیوں کہلاتی۔

آج سہ پہر کچھ دیر پڑوس میں بیٹھ کر رحیمہ بی بی جب گھر واپس آئیں تو چھوٹی بیٹی نجمہ آنگن میں جھکی ہوئی جھاڑو دے رہی تھی۔ ماں کو دیکھ کر وہ سٹپٹا کر سیدھی کھڑی ہوگئی۔

رحیمہ بی بی کی تیز نگاہوں نے بیٹی کے اضطراب کو محسوس کیا پھر نجمہ کے ارد گرد نظر دوڑائی انھیں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ اچانک انھیں سلمیٰ کا خیال آیا تو وہ کوٹھڑی کی جانب لپکیں جونہی وہ کوٹھڑی تک پہنچیں ان کے پیروں کو مقناسی قوت نے جکڑ لیا اُن کے قدم جہاں کے تہاں ہی جم کر رہ گئے۔ اندر کی سرگوشیاں باہر آرہی تھیں اور وہ سلمیٰ کی آواز صاف پہچان رہی تھیں۔ گھڑی بھر کو اُن پر سکتہ طاری رہا پھر شرم و غیرت کے ملے جلے جذبات نے اُن کے خون کو کھولانا شروع کیا تو اُن کا مرجھایا ہوا سفید چہرہ خون کی روانی سے سرخ ہو کر تپنے لگا۔ گردن کی رگیں اُبھر آئیں۔ اپنی چڑھتی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کے لیے انھوں نے اضطراری طور پر کوٹھڑی کی چوکھٹ کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ چند لمحے سوچتی رہیں پھر سنبھالا لے کر پیچھے ہٹ آئیں۔ اور بلند آواز میں نجمہ سے بولیں "اری ماری گئی دن بھر جھاڑو ہی دیتی رہے گی یا چولھا بھی سلگائے گی۔ شام ہونے کو آئی بہن کہاں ہے اس سے چولھا جلانے کو کہہ"

رحیمہ بی بی کے جملے کا سائرن سن کر اندر کوٹھڑی کی سرسراہٹیں افراتفری میں تبدیل ہوگئیں گویا بمباری کا اعلان ہوا ہو۔ پھر فوراً ہی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور دتو جھینپا، جھینپا سا باہر نکلا۔ رحیمہ بی بی سے آنکھیں چار ہوتے ہی اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "سلام علیکم خالہ!" خالہ کچھ بولی نہیں صرف اسے قہر آلود نظروں سے گھور کر رہ گئیں۔

دتو نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے گردن جھکائی اور سیدھا آنگن پار کرتا چلا گیا۔

رحیمہ بی بی نے جب دیکھا دتو چلا گیا تو وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کوٹھڑی میں جا گھسیں۔ سلمیٰ کواڑ کی آڑ میں سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ انھوں نے اس کی چٹیا پکڑ کر کھینچی اور پھر اس کی پیٹھ پر پیدا ہونے والی مُکّوں کی دھمک اور سلمیٰ کی کراہوں پر رحیمہ بی بی کی مغلظات بھاری تھیں۔ آن کی آن میں بڑی بی کے ہاتھ چوڑیوں سے بے نیاز ہوگئے۔ پھر وہ خود بھی رونے لگیں "حرافہ، قطامہ، نوچی، ہم جوان نہیں ہوئے تھے کیا تجھ پر دنیا سے نرالی جوانی آئی ہے جو خاندان کے منہ پر کالک لگوانے پر تلی ہوئی ہے۔ جا... یہاں سے نکل جا، اپنا منہ کالا کر لے نہیں تو ایک پڑیا کھا کر سو جا، ایسی اولاد سے تو بے اولاد ہونا بہتر ہے" کافی دیر تک

وہ روتی رہیں۔ پھر دھیرے دھیرے ان کی آواز مدھم ہوتی گئی اور وہ بے سُدھ ہو کر پڑ گئیں۔ کچھ دیر بعد اُن کے منہ سے ایک ہلکی سی ہائے نکلتی اسی کے ساتھ ہی وہ ایک لمبا سانس کھینچتیں اور خاموش ہو جاتیں جیسے طوفان کے بعد بھی ہوا کے جھکڑ چلتے رہتے ہیں۔

اس واقعے کو گزرے آج تیسرا دن تھا۔ دتو کی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ رحیمہ بی بی کی نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ انتڑیوں کی جلن نے حمیت کو فنا کر کے سارا غصہ کافور کر دیا تھا۔ دو روز تو کسی نہ کسی طرح پاس پڑوس سے قرض اُدھار کر کے پیٹ کی دوزخ کا ایندھن مہیا کر لیا تھا لیکن آج مکمل فاقہ تھا۔ انھیں بڑی بے چینی سے دتو کا انتظار تھا۔ دن ڈھلتے دروازے پہ دستک ہوئی۔ بے کلی کو کچھ آس نظر آئی۔ وہ بے قرار ہو کر دروازے کی جانب لپکیں۔ کُنڈی گرا کر دروازہ کھولا تو سامنے رحمت کا فرشتہ کھڑا نظر آیا تسکین کے طور پر اُن کے منہ سے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس نکل گئی۔ انھیں دتو کا مُسکراتا ہوا چہرہ آج بہت پیارا لگا۔ بے اختیارانہ طور پر ان کے منہ سے نکلا "بیٹا خیر تو ہے، تین دن سے کہاں غائب ہو؟ آؤ اندر آؤ۔"

جواب میں دتو نے اپنی گردن ہلائی اور دھیرے سے مسکرا دیا گویا سب کچھ اس کی توقع کے مطابق ہو رہا ہو۔ اندر دالان میں چوکی پر بیٹھتے ہوئے دتو نے رحیمہ بی بی کو مخاطب کیا "خالہ! آپ کے لیے ایک خوشخبری ہے۔"

"بیٹے! مجھ بدنصیب کے لیے اس دنیا میں کیا خوشخبری ہو سکتی ہے۔" خالہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"آپ سُنیے تو سہی، جی خوش ہو جائے گا۔" دتو چہکا "استاد کہہ رہا تھا "جبار کی قید کی مدت پرسوں پوری ہو جائے گی۔ وہ واپس آ جائے گا۔"

"کیا....؟" رحیمہ بی بی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ اُن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ جو ماحول کی تپش سے جھلس جھلس کر نیم جاں ہو گئی تھیں دتو کی بات سُن کر اُن کا چہرہ یوں کھل اُٹھا جیسے عین دوپہری میں کوئی بالٹی بھر پانی چمیلی کے پودے میں ڈال دے۔ دتو کے الفاظ کی ٹھنڈک کانوں کی راہ سن سن کرتی اُن کے وجود میں اُترتی چلی گئی....

جس کی تراوٹ انھیں اپنے کلیجے میں اُترتی محسوس ہوئی۔ وہ دلّو سے اپنی نفرت کو بھول گئیں اور باچھیں پھیلا کر بولیں "سچ بیٹا! میرا جبار پرسوں واپس آجائے گا؟"

دلّو نے خالہ کے چہرے پر جو خوشی کی لہریں موجزن دیکھیں تو اس کی مزید ہمت بندھی۔ اس نے اثبات میں جلدی جلدی اپنی گردن ہلائی اور بولا "ہاں خالہ آج استاد کہہ رہا تھا، میں آپ کو بتلا دوں جبار پرسوں چھوٹ جائے گا۔"

پرسوں کے انتظار میں رحیمہ بی بی اس بات سے بھی غافل ہوگئیں کہ دلّو کے قدم اُن کے گھر میں دوبارہ جم رہے ہیں۔

پھر پرسوں کی صبح رحیمہ بی بی کے لیے بہت بھیانک تھی۔ صبح جب وہ سو کر اٹھیں تو انھیں معلوم ہوا سلمیٰ گھر سے غائب ہے۔ وہ دلّو کے ہمراہ رات کو ہی نکل بھاگی۔

جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ جب جبار گھر میں داخل ہوا تو اسے عجیب سے سناٹے کا احساس ہوا۔ نجمہ تخت پر بیٹھی کشیدہ کاری کر رہی تھی اور ماں منہ سر لپیٹے پڑی ہوئی تھیں نجمہ نے بھائی کو کھوئی کھوئی نگاہوں سے دیکھا مگر کچھ بولی نہیں۔ جبار قریب آیا اور نجمہ سے گویا ہوا "کیا بات ہے یہ گھر میں سناٹا کیسا ہے اماں کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

جبار کی آواز سن کر رحیمہ بی بی نے آنکھ کھولی۔ دوپٹہ منہ پر سے ہٹایا۔ پھر لیٹے ہی لیٹے بیٹے کو کھینچ کر چھاتی سے لگا لیا "میرے بچے، میرے لعل......" بمشکل تمام ان کے منہ سے نکل سکا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ جبار ذرا دیر اخفقت کا مارا ماں کی چھاتی سے چپکا رہا۔ گھٹا ٹوٹ ٹوٹ کر آئی اور خوب خوب برسی۔ بڑی بی کی آنکھوں کے پرنالے اُن کے رخساروں پر سے پھسلتے ہوئے جبار کے چہرے پہ بہتے رہے۔ وہ دل جو صبح سے غم کے بوجھ سے ڈوبا جا رہا تھا اُس کا بوجھ ہلکا ہوا تو بڑی بی نے گہری گہری سانسیں لینا شروع کر دیں اور اپنے اوسانوں میں واپس آنے کے بعد انھوں نے بیٹے کو سلمیٰ کے بارے میں بتلایا۔

ماں کی بات سُن کر جبار کے ہوش جاتے رہے۔ اس نے سوال کیا "اماں! تم نے سلمیٰ کو کہاں کہاں تلاش کیا؟"

" بیٹا! میں عورت ذات کہاں ڈھونڈتی بس تیرا انتظار کر رہی تھی تو ہی کھوج کر جب میرے لال۔ جلدی کر۔"

جبار تھکا ہارا رات گئے واپس آیا اور ماں کے گلے سے لگ کر روتا ہوا بولا "اماں کچھ پتہ نہیں چل سکا بس اتنا معلوم ہوا ہے د تو یہ شہر چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا ہے۔"

دو روز تک جبار گھر سے باہر نہیں نکلا۔ ماں اس کو سمجھاتی رہی " بیٹا! تو یہ دھندہ چھوڑ دے اللہ رزاق ہے وہ کچھ اور سبیل نکال دے گا۔ اور ہاں آج جمعہ کا دن ہے جا بیٹا نماز کو جا اور توبہ استغفار کر۔" جبار نے اثبات میں گردن ہلائی اور ٹوپی لے کر مسجد کی جانب چل دیا۔

وہ مسجد کے دالان میں سر جھکائے بیٹھا تھا کہ خطبہ سے قبل امام صاحب نے واعظ کے لیے تلاوت شروع کر دی۔ جوں ہی جبار کے کانوں میں لحنِ داؤدی پہنچی اس نے چونک کر ممبر کی جانب دیکھا۔ مولانا نہایت استقلال کے ساتھ قرأت کر رہے تھے۔ آواز کا اُتار چڑھاؤ ایک لَے میں بندھا ہوا تھا اور اس کی کشش جبار کو اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ جبار کی سرشاری بڑھتی گئی اور وہ مسحور ہو کر رہ گیا۔

تلاوت ختم ہوئی اور واعظ شروع ہو گیا۔ جبار کا دل پگھلنا شروع ہو گیا تھا۔ امام صاحب کہہ رہے تھے "نماز کا نہ پڑھنا، روزے کا نہ رکھنا معاف ہو سکتا ہے لیکن حقوق العباد معاف نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے اختیار میں نہیں ہے جس کا معاوضہ تم پر واجب ہے وہی معاف کر دے تو معافی ہے ورنہ نہیں۔ خداوند کریم ظالم کو پسند نہیں فرماتا۔ نبی کریمؐ بھوکے رہے پیٹ پر پتھر باندھے لیکن کبھی کسی کی امانت میں خیانت نہ کی۔"

جبار کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ سوچ رہا تھا گذشتہ برس اُس نے جس آدمی کی پاکٹ ماری تھی وہ کیسا بلک رہا تھا " ہائے میری پونجی کس نے نکال لی اس مہینے میرے گھر کا خرچ کیسے چلے گا؟" اور وہ بیرا اسٹوڈنٹ جس کی اس نے جیب کاٹی تھی تو دوسرے روز اس کی لاش ملی تھی۔ اُس نے خودکشی کر لی تھی کیوں کہ

وہ اپنے امتحان کی فیس نہیں بھر سکا تھا۔ اسی قسم کے بہت سے خیالات جبار کے ذہن میں چکرانے لگے۔ اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ اس نے تہیہ کیا وہ یہ غلط کام اب کبھی نہیں کرے گا۔

جبار ارادہ تو کر بیٹھا لیکن اس سے ناواقف تھا کہ آزمائش اور امتحان کی راہیں بہت دشوار اور کٹھن ہوتی ہیں۔ پاکٹ ماری کے علاوہ کسی دوسرے ہنر سے اُسے آشنائی تک نہیں تھی۔ اُس نے ملازمت کے لیے جان توڑ کوشش شروع کر دی مگر نوکری کا ملنا بھی مشکل تھا۔ بھلا پاکٹ مار کو ملازم کون رکھتا۔ جلد ہی تنگ دستی اور بھوک کے مہیب دیو اس کے آنگن میں ناچنے لگے، آخر کار جب وہ بہت پریشان ہو گیا تو اس کے قدم خود بخود استاد کے اڈے کی جانب اُٹھ گئے۔

استاد نے اسے دیکھتے ہی حیرت کا اظہار کیا "ابے جبار کہاں ہے تو؟ تو نے یہ ہڑتال کیسی کر رکھی ہے۔ تو کمیشن کیوں نہیں لا رہا ہے بے۔ کیا ایک بار کی مار سے ہی تیری ساری ہوا نکل گئی؟"

جبار نے گردن نیچی کر لی اور بولا "استاد میں نے یہ خراب دھندہ بند کر دیا ہے۔"

"کھراب دھندہ...؟" استاد نے آنکھیں پھاڑ کر جبار کو حیرت سے دیکھا پھر ایک قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے ساتھی بھی ہنسنے لگے۔ سب کو ہنستے دیکھ کر استاد بولا "سالو! ہنسو مت، اس سے پوچھو ماں بہن کا پیٹ بھرنے کے لیے یہ کیا کرے گا اسے اور کیا کام آتا ہے۔ ابے جبار من جیادہ پارسائی ہم کو جیب نہیں دیتی ہم سماج کے منہ پر کلنک اور نالی کے کیڑے مانے جاتے ہیں تجھے اسی گندی نالی میں جینا ہو گا۔ سمجھا کچھ، ورنہ بے موت مارا جائے گا۔ تو دوسرا کوئی اور دھندہ تو کر ہی نہیں سکتا۔ تجھے تو جوتے تک گانٹھنا نہیں آتے کھوب سوچ سمجھ کر پھیسلہ کر یا پھر بہن کو چکلے میں بٹھا دے۔ وہاں سے کبھی تیرے لیے انکم کا دروجہ کھل سکتا ہے۔"

جبار کے چہرے پہ ایک رنگ آیا اور ایک گیا۔ وہ حلق میں تھوک نگل کر رہ گیا۔ اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ استاد کے سامنے مزید زبان کھولے۔ اتنے میں جبار کا دوست فضلو آگیا۔ استاد نے فضلو کو دیکھا تو اس سے بولا "ابے پھجلو اپنے دوست کو سمجھا اس کے بہت پر نکل رہے ہیں"۔

اس سے قبل کہ فضلو کچھ بولے جبار نے فضلو سے کہا "فضلو مجھے تجھ سے کچھ کام ہے ذرا باہر چل"۔ پھر اس نے اس کا بازو پکڑا اور اسے باہر لیتا چلا گیا پھر اسے مخاطب کر کے بولا "یار فضلو مجھے کچھ روپیہ چاہیے میرا کام نکال دے میں کوئی دھندہ تلاش کر کے تیرا قرض جلد ہی ادا کر دوں گا"۔ فضلو نے مسکرا کر دو سو روپے جبار کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

پل کے پل میں ایک مہینہ گزر گیا۔ جبار کو سخت کوشش اور جستجو کے بعد بھی روزگار نہ مل سکا۔ آج کل اس کی گزر اوقات کا انحصار فضلو کے قرض پہ ہی تھا۔ ادھر کئی روز سے ماں کی طبیعت بھی خراب چل رہی تھی اور آج پھر جبار کی جیب بالکل خالی تھی۔ وہ فضلو کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ آخر ایک جگہ سڑک پر اس سے ملاقات ہو ہی گئی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد جب جبار اصل مطلب کی جانب آیا تو فضلو ہنستے ہوئے بولا "میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا تجھے میری کھوج کیوں ہے۔ یار اپنے یار کے کام نہیں آئے گا تو کون آئے گا لے یہ رکھ" اس نے سو سو کے دو نوٹ جبار کو پکڑا دیے اور بولا "دیکھ دو ہزار ہو گئے تیری طرف سب حساب رکھنا"۔ پھر ایک لحظہ تامل کے بولا "یار جبار میں بہت دن سے ایک بات سوچ رہا ہوں پر تجھ سے کہہ نہیں پاتا پتہ نہیں تُو بُرا مان جائے"۔

جبار نے اُس کی جانب پُر استفسار نظروں سے دیکھا تو فضلو نے بڑے پیار سے جبار کا ہاتھ تھاما اور مُسکرا کر بولا "یار تو بجّو کو کب تک گھر میں بٹھائے رکھے گا اُسے میرے ساتھ کر دے میرا دُنیا میں اور کون ہے تُو تو جانتا ہی ہے۔ میرے ساتھ شادی کر کے وہ عیش کرے گی۔ اور میں اپنا سارا قرض بھی معاف کر دوں گا"۔

جبار کے دماغ میں بھک سے ایک شعلہ اُٹھا اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں اور سانس بے ترتیب چلنے لگی۔ گویا فضلو نے اُسے گندی گالی دی ہو۔ غصّے اور جذبات کی

زیادتی سے اُس کی گویائی سلب ہوگئی۔ وہ ٹکر ٹکر فضلو کی صورت تکتا رہا۔

فضلو کچھ اور قریب آیا اور بڑی اپنائیت سے جبار کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا "یار جلدی کیا ہے اماں سے مشورہ کر لے۔"

جبار کے منہ سے درد میں ڈوبی ہوئی عجیب طرح کی گمبھیر آواز نکلی جیسے وہ کسی کنویں میں سے بول رہا ہو "مشورہ، مشورے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا فضلو جو تو سوچ رہا ہے وہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں تیرا قرض بہت جلد ادا کر دوں گا۔"

واپسی پر راستے بھر جبار کے دماغ میں ہیجان رہا۔ یا اللہ وہ کیا کرے فضلو ایک پاکٹ مار ہے اور جواری شرابی بھی۔ پتہ نہیں وہ نجمہ کے کوڑے کب کرلے۔ نہیں نہیں میں نجمہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہرگز نہیں دوں گا۔"

کام کی تلاش میں اُس نے اپنی تگ و دو تیز کر دی مگر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کام اس کے آگے آگے بھاگ رہا ہے اور وہ کام کے پیچھے جتنا وہ اس کے لیے دوڑتا کام اس سے اتنا ہی آگے بھاگ جاتا۔ پھر آہستہ آہستہ جبار کی جیب بھی ہلکی ہوتی گئی اور بالکل خالی ہوگئی۔ بھلا دو سو روپے کہاں تک ساتھ دیتے۔ جب دو وقت کے فاقوں نے اُسے مُردہ کر دیا تو جبار کے قدم خود بخود اپنے پرانے اڈے کی جانب اُٹھ گئے۔ اُسے توقع تھی استاد کچھ قرض دے دے گا مگر استاد باہر گیا ہوا تھا۔ سامنے فضلو بیٹھا ہوا ملا۔ وہ شراب کے نشے میں دُھت تھا۔ اُسے دیکھتے ہی فضلو نے کرارے کرارے نوٹ جیب سے نکالے اور بولا "ایک ساتھ مانگ لے ظالم ترپاتا کیوں ہے، جا بہن کو لے آ۔"

جبار کو گویا کسی نے جلتے ہوئے الاؤ میں ڈال دیا۔ تپتے ہوئے خون کی روانی دماغ میں دھمک پیدا کرنے لگی۔ اُس کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں اور وہ اپنا ہوش کھو بیٹھا۔ بالکل مشینی انداز میں اس کا ہاتھ فضلو کے منہ پر پڑا۔ چوٹ کھاتے ہی فضلو جبار سے لپٹ گیا۔ اور دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ فوراً ہی دوسرے ساتھی دوڑ پڑے اور دونوں کو علیحدہ کر دیا۔ پھر ایک ساتھی نے جبار کو سمجھایا۔ فضلو پیئے ہوئے ہے اسی لیے ایسی باتیں کہہ بیٹھا ہے۔ جاؤ تم ابھی گھر چلے جاؤ ورنہ بات بڑھ جائے گی۔"

جبار جب وہاں سے رخصت ہوا تو سخت ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اس کے دماغ میں آندھیوں کے جھکڑ مل رہے تھے۔ کچھ کچھ دیر بعد اس کی خشک آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو یوں گرتے جیسے پختہ مکان کی چھت موسم کے دباؤ سے تڑخ گئی ہو اور برسات کا پانی رِس رہا ہو۔ وہ اپنی انگلیوں کے پوروں سے اُبلتے ہوئے آنسو صاف کرتا ہوا غیر شعوری طور پر تیز تیز قدم اُٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ اُسے اس کا بھی احساس نہیں تھا کہ گرمی اور دھوپ کی تپش سے اس کی حالت غیر ہو چکی ہے اور وہ پسینے میں شرابور ہے۔ وہ ایک مسجد کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اس نے کھوئی کھوئی آنکھوں سے گردن اُٹھا کر مسجد کے میناروں کو دیکھا جہاں سے حیّ علی الفلاح کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ اسے اس پکار میں ایک خاص کشش محسوس ہوئی اور اس کے قدم کسی خود کار مشینی انداز میں مسجد کی جانب اُٹھ گئے۔

وہ وضو کر کے اندر دالان میں پنکھے کے نیچے بیٹھا تو اسے نہایت طمانیت اور سکون کا احساس ہوا ساتھ ہی ایک اور احساس بھی اس کے اندر جاگا کہ خالی پیٹ بُری طرح جل رہا ہے۔ جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں ہے۔ ادھر فضلو سے بھی جھگڑا ہو گیا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا اور مسجد میں نمازیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ اچانک اس کی نگاہوں میں بجلی کوند گئی۔ اس کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔ اس کے سامنے ایک باریش بزرگ اپنے وائل کے کُرتے کی جیب سے رومال نکال کر اپنا چہرہ خشک کر رہے تھے اور ان کی جیب کی چلمن سے جھانکتے ہوئے ہرے ہرے نوٹ اپنی جھلکیوں سے جبار کے ضبط کے خرمن کو پھونکے دے رہے تھے۔

اتنے میں جماعت کے لیے صف بندی شروع ہو گئی۔ جبار نے آن کی آن میں ایک فیصلہ کیا اور وہ اُن بزرگ کے بازو سے بازو ملا کر نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ موقع پاتے ہی اس کی انگلیاں لمحہ بھر کے لیے بڑے میاں کی جیب میں کسی سانپ کی طرح رینگ گئیں اور بل کھاتے ہوئے جب واپس پلٹیں تو بڑے میاں کی جیب کے ساتھ ساتھ جبار کے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو چکا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد جبار مسجد کی سیڑھیاں اُترتا ہوا باہر آیا تو پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ راہ گیر اس کو حیرت سے تک رہے ہیں۔

روزگار

ساوتری خیالات میں کھوئی ہوئی اپنے گھر کی جانب چلی جا رہی تھی کہ اچانک اُس کی نظر سامنے گلی کے موڑ پر جم گئی جہاں پانی کا نل تھا وہاں عورتوں اور بچوں کی کافی بھیڑ جمع تھی۔ بے اختیار اُس کا ہاتھ اپنی ساری کے پلّو کی طرف گیا۔ اُس نے پلّو کو سر پر ٹھیک طور سے جمایا اور اپنے پیروں کی جانب دیکھتی ہوئی کہ ساری سب طرف سے برابر ہے یا نہیں۔ وہ آگے بڑھی تو سب سے پہلے اس کی نظر اوما دیوی سے ٹکرائی۔ انھیں دیکھتے ہی سراسیمگی کی ایک لہر اُس کے وجود میں اُترتی چلی گئی۔ بے اختیارانہ طور پر اس نے انھیں پرنام کرنا چاہا اوما دیوی اسے دیکھتے ہی نہایت زہریلے انداز میں مسکرائیں۔ اُس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی ترچھی نگاہوں سے آس پاس کھڑی عورتوں کو اشارے کیے گویا کہہ رہی ہوں لو سنبھالو تمسکار آ رہا ہے۔ اس سے قبل کہ ساوتری غصّے کی ڈھال استعمال کرے کئی زہریلے تیر آنکھوں کی راہ اس کی روح کو کچا کچھ چھیدتے چلے گئے۔

وہ بچی نہیں تھی۔ منہ ٹیڑھا کر کے مسکرانے کے انداز اور برساتی ہوئی نگاہوں کا مطلب خوب اچھی طرح جانتی تھی۔ گھبرا کر اُس نے اپنے دونوں ہاتھ نہایت دھیرتا کے ساتھ ان لوگوں کی جانب جوڑ دیے گویا نمستے نہیں التجا کر رہی ہو، مگر وہاں کس کو غرض تھی کہ نمستے کا جواب دے ان کی مضحکانہ مسکراہٹوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔

وہ جب پاس سے گزرنے لگی تو ایک آواز آئی ہائے بے چاری ساوتری.....

اس کے جواب میں کسی نے کہا... سُمت ساوتری یا ستنا... اُس پر کئی قہقہے گونجے۔ نام تو

اماں نے شوق میں ساوتری رکھ دیا مگر لچھن .... ؟ ارے لچھن کی چھوڑو ساوتریوں کے بھی لچھن ہوتے ہیں کیا ؟ اس پر مزید قہقہے بلند ہوئے۔

ساوتری نے گھوم کر بھی نہیں دیکھا کہ حملہ آوروں میں کون کون ہے۔ بس وہ لمبے لمبے قدم بڑھاتی اپنے گھر کی جانب بڑھتی چلی گئی۔

اپنے گھر کے بند کواڑوں کو اس نے دھیرے سے اندر دھکیل دیا اور گھر میں داخل ہو گئی۔ سامنے ہی چارپائی بچھی تھی۔ چارپائی پر نظر پڑتے ہی اسے تھکن اور کمزوری کا احساس بُری طرح سے ہوا اور وہ چارپائی پر دھڑام سے جا گری۔ آج کئی روز بعد پھر ان چڑیلوں سے مُڈبھیڑ ہو گیا تھا۔ اسے ان سب سے نفرت تھی جن کے پاس جاہلیت کی ڈگریوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ دوسروں کی ٹوہ میں رہنا ان کا محبوب مشغلہ تھا اور خواہ مخواہ کا شک کرنا ان کی فطرت تھی۔ یہ اپنی ذہنی تسکین کی خاطر تہمت تراشی کی داستانیں گھڑا کرتیں اور ایک دوسرے کو مزے لے لے کر سنایا کرتیں۔

اسے اپنے آپ پر غصّہ آ رہا تھا کہ وہ آخر ان سے دبتی کیوں ہے ؟ اُس نے اُما دیوی کو نمستے کیوں کیا ؟ ضرورت ہی کیا تھی ؟ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ عورتیں اس کے چاروں طرف گھیرا ڈالے کھڑی ہوں اور چیخ چیخ کر کہہ رہی ہوں ہائے بیچاری ساوتری سُمت یا سنتا ... سُمت یا سنتا۔ اپنی بے بسی پر اسے رونا آنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے پیالے لبالب بھر گئے۔ اس سے قبل کہ چھائی ہوئی گھٹا کھُل کے برسے۔ اور وہ ہلکی پھُلکی ٹپاٹپ بھی ایک مدھر اور ممتا بھری آواز سُن کر یک لخت یوں تھم گئی گویا کسی نے کار کا انجن اسٹارٹ کر کے دوبارہ اگنیشن کی چابی گھما دی ہو۔

آواز دوبارہ آئی۔ ساوتری او ساوتری کیا آج پھر پیدل چل کر آئی ہے کتنی بار کہا ہے بس نہ ملا کرے تو رکشہ پکڑ لیا کر۔ اس کی ماتا شانتی دیوی رسوئی گھر سے نکلتی ہوئی اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔

اس نے جو ماں کو اپنی جانب آتے دیکھا تو جلدی سے آنکھوں کو پلّو سے صاف کیا اور گالوں کو پونچھتی ہوئی اُٹھ بیٹھنے کی کوشش کی۔

ماں کی ممتا بھری آواز سنائی دی "لیٹی رہ لیٹی رہ تھک گئی ہوگی۔"

ماں جب قریب آئی اور اس نے اس کی نم پلکوں کو دیکھا تو نہایت پیار سے بولی "بیٹی! تو بڑی ضدی ہے جو اپنی جان ہلکان کیے دے رہی ہے۔ میں کب سے کہہ رہی ہوں مجھے اچھا خاصا سینا پرونا آتا ہے۔ دیکھ آج محلے سے میں کچھ کپڑے سلائی کے لیے لے آئی ہوں۔ اس محلے میں ہم نئے ہیں تو کیا۔ پر کام کی کمی کہیں بھی نہیں ہے۔"

ماں کی بات سن کر ساوتری تڑپ کر اُٹھ بیٹھی اور بولی "ماں! آخر تم نہیں مانی نا۔ میں بھرم رکھنے کی کوشش میں اپنی جی جان ایک کیے دے رہی ہوں اور تم ہو کہ سمجھتی ہی نہیں۔ کچھ دن اور صبر کر لیتیں اب محلے والے ہمیں اور بھی گھٹیا سمجھیں گے۔ اپنی بے عزتی میں برداشت نہیں کر سکتی ماں۔" یہ کہتے ہوئے وہ ماں سے لپٹ گئی اور وہ گھٹا جو کافی عرصے سے چھا رہی تھی چھما چھم برس پڑی۔ ماں سے بھی برداشت نہ ہوا وہ بھی اندر ہی اندر گھٹ رہی تھیں۔ ان کے ضبط کا بندھ بھی ٹوٹ گیا۔ آخر ماں کو ہی ہوش آیا تو اس نے بیٹی کو اپنی چھاتی سے الگ کیا اور پیشانی چومتی ہوئی بولیں "نہ رو میری بچی، میری چندا! یوں ہمت نہ ہار۔ اگر تو ہمت ہار جائے گی تو میں سمجھوں گی میرے جیون بھر کی محنت سب اکارت گئی۔ میں کب تک زندہ رہوں گی تجھے ہی اس زمانے سے مقابلہ کرنا ہے۔ میرا آشیرواد تیرے ساتھ ہے۔ آج نہیں تو کل بھگوان ہماری ضرور سنے گا۔ تجھے کام ضرور ملے گا اور بہت اچھا اور بھی ملے گا۔ بھگوان نردئی نہیں وشواس رکھ۔ ودھاتا جب تیرے اوپر مہربان ہوگا تو اس کی کرپا دیکھ کر تو بھی حیران رہ جائے گی پر آس رکھ آس۔

ماں! مجھے اپنی ناداری کا رونا نہیں ہے۔ بس مجھ سے اس چنڈال چوکڑی کے بان سہے نہیں جاتے۔ وہ مجھے نربل سمجھتے ہوئے نہایت اوچھی اور گندی باتیں کرتی ہیں۔ ان کی جملے بازی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔

شانتی دیوی نے خفیف سا تبسم کیا اور بولیں بیٹی اسی کا نام وقت ہے کل جب تیرا سمے آئے گا تو یہی لوگ جھک کر تجھے نمستے کریں گے۔ اب کام کی بات کر۔ کیا ہوا کچھ بات بنی؟" ساوتری نے نفی میں سر ہلا دیا۔

شانتی دیوی دوبارہ گویا ہوئیں" ایک جگہ میں نے تیرے کام کی بات چلائی ہے بابو ہردیال جی ہمارے محلے کے سامنے والی کالونی میں رہتے ہیں۔ میں گھومتی گھامتی ان کے ہاں پہنچ گئی تھی وہاں پر میں نے بابو جی سے بات کی ہے۔ اُن کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ وہ تیری پڑھائی کا پوچھ رہے تھے میں نے بتلادیا بی کام پاس ہے۔ انھوں نے ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کا بھی پوچھا۔ میں نے کہہ دیا ٹائپ کرنا آتا ہے شارٹ ہینڈ سیکھ رہی ہے۔ کل تجھے انھوں نے بلایا ہے۔ کل شام ان کے گھر چلی جانا۔ میرے پاس سلائی کا کافی کام جمع ہوگیا ہے ورنہ میں خود ساتھ چلتی۔

ساوتری نے کھوئی کھوئی آنکھوں سے ماں کی جانب دیکھا اور بے یقینی سے مسکرادی۔

دوسرے روز شام کو وہ ماں سے بابو ہردیال کا پتہ معلوم کر کے اُن کے گھر پہنچ گئی۔

بابو ہردیال بڑے آدمی تھے اس لحاظ سے ان کا مکان بھی شاندار تھا۔ سب سے پہلے اس کا سامنا بابو جی کی پتنی سے ہوا۔ نجانے کیوں انھوں نے اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا اور ہلکے سے تبسم سے بولیں "بیٹھو، بابو جی ابھی آتے ہیں" وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئی پر اُس کا ذہن بابو جی کی پتنی کی مسکراہٹ میں اُلجھ کر رہ گیا۔ کیسی اُداس اُداس سی مسکراہٹ تھی ساتھ ہی چہرے پر خوف کی پرچھائیاں بھی اور شاید نگاہوں میں طنز بھی تھا۔ کچھ عجیب سے ملے جُلے جذبات تھے اُن کے چہرے کے۔ وہ ان کو کوئی معنی نہ پہنا سکی۔ پھر اسے خیال آیا وہ دوسروں کے بارے میں اتنا کیوں سوچتی ہے۔ مسکراہٹ.... طنز.... شاید وہ احساس کمتری میں مبتلا ہوتی جارہی ہے۔

وہ انھیں خیالات میں کھوئی ہوئی تھی کہ سامنے سے بابو ہردیال آتے دکھلائی دیے۔ وہ بوکھلا سی گئی اور تعظیم کے لیے کھڑی ہوگئی۔ اس کے دونوں ہاتھ خود بخود آپس میں نمستے کے لیے جُڑ گئے۔

"بیٹھو بھئی بیٹھو" بابو جی کا لہجہ شیریں تھا" تمھاری ماتا جی آئی تھیں اور تمھارے

بارے میں کہہ رہی تھیں "کیا نام ہے تمھارا؟ بھئی میں تو بھول ہی گیا" یہ کہتے ہوئے وہ صوفے میں دھنس گئے۔

"ساوتری"

"بڑا اچھا نام ہے۔ ہاں تمھاری ماتاجی کہہ رہی تھیں تم نے بی کام کر رکھا ہے۔ اور ابھی بیکار ہو۔ بھئی یہ تو بڑے افسوس کی ہے پر کیا کیا جائے۔ آج کل ہمارے دیش کی حالت ہی ایسی ہے۔ بے شمار لوگ ڈگریاں لیے کام کی تلاش میں دن دن بھر بھٹکتے رہتے ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں تم تو ہمارے محلے کی ہی ہو۔ ہم تمھارے لیے کام نکال ہی لیں گے ہمارے یہاں پرسنل سکریٹری کی جگہ خالی ہے۔ شارٹ ہینڈ میں تمھیں کتنی مہارت ہے؟"

بابوجی اتنی مہربانی سے بات کریں گے اور اسے نوکری یوں آسانی سے مل جائے گی اس کا اُسے گمان بھی نہ تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ ان کے سوال کا جواب دیتی وہ حیران حیران نظروں سے انھیں تکنے لگی۔

بابوجی اس کی حیرانی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مسکرا کر بولے "ارے گھبراؤ نہیں جواب دو۔"

اب ساوتری کو ہوش آیا۔ بابوجی بڑی میٹھی نظروں سے اُسے تک رہے تھے اس کی ساری کا آنچل اس کے سینے پر سے ڈھلک گیا تھا۔ اس نے گھبرا کر اپنے آنچل کو درست کیا اور بولی "شارٹ ہینڈ سیکھ رہی ہوں ابھی پکی نہیں ہوئی ہوں۔"

بابوجی کے لہجہ میں شہد گھُل گیا "کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں۔ دھیرے دھیرے پکی بھی ہو جاؤ گی۔ آج اٹھائیس تاریخ ہے۔ دو روز بعد پہلی ہے۔ تم اپنا ایگریمنٹ پکا سمجھو۔ پہلی کو دفتر پہنچ جاؤ۔ پہلے ہم تین ہزار دیں گے پھر اسکیل بڑھ جائے گا۔ اگر ہم نے تمھیں اپنی مرضی کے مطابق پایا تو اسکیل کی کوئی بات نہیں۔ تمھیں تمھارے گمان سے کہیں زیادہ ملے گا۔

ساوتری کو اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ وہ انھیں منہ کھولے حیرت سے یوں تکنے لگی جیسے بچپن میں اپنی نانی سے پریوں کی کہانی سنتے وقت حیرت سے اس کا منہ کھلا رہ جاتا

تھا ۔۔۔ بابوجی کو اس کا کھویا کھویا سا انداز بہت پیارا لگا۔ وہ مسکرا کر نہایت پیار سے بولے "کیا اسکیل کم ہے ؟"

اتنے میں ہر دیال بابو کی پتنی کمرے میں داخل ہوئیں اور قدرے ترش ہوکر بولیں "بات ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔ کیا جانا نہیں ہے ؟"

بابوجی کی پتنی کی آواز سن کر ساوتری گویا خواب سے چونکی۔ پھر اسے اس احساس سے کہ وہ جو کچھ دیکھ اور سن رہی ہے حقیقت ہے اس کے پورے وجود میں خوشی اور طمانیت کی لہریں دوڑنے لگیں۔ وہ اچانک اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی "بہتر ہے میں جوائن کر لوں گی۔ نمستے کرتے ہوئے وہ جھپاک سے کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح ماں تک اُڑ کر پہنچ جائے۔ اور انھیں یہ خوشخبری سنا دے۔

وہ خوشی سے لبریز تمتماتے ہوئے چہرے پہ ہزاروں مسکراہٹیں بکھیرتی ٹیک جھیک اپنے گھر کی جانب چلی جارہی تھی۔ اس خوشی کے طوفان میں اُڑتی ہوئی وہ گلی کے نکڑ پر کالونی کے باہر پانی کے نل کے پاس آپہنچی جہاں ہر شام چنڈال چوکڑی کا جمگھٹ لگا رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ یہاں سے پرنام کرتی ہوئی گزرا کرتی تھی۔ وہاں موجو عورتوں نے اسے ایسی چال چلتے دیکھا تو مسکرائیں۔ ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ہاہر تو باہر اب محلے کے گھر بھی اس لونڈیا سے نہیں بچ پاتے۔

ساوتری ایک لمحے کو ٹھٹکی اور گھبرا کر اس نے پیچھے دیکھا مگر پھر اس کے قدم خود بخود تیز ہو گئے۔

"دیکھا اس چھوکری کو کیسی ہمت ہوگئی ہے اس کی، اب پرنام تک نہیں کرتی۔" اُما دیوی سب سے پہلے بولیں۔

"ارے بیچاری کیا پرنام کرے۔ کون سا اچھا کام کرکے آرہی ہے ......!!" شکنتلا دھیرے سے مسکرائیں۔

"آخر یہ چھوکری کتنے کما لاتی ہے جو گھر کا خرچ چل رہا ہے۔"

"ارے بھئی کوئی ریٹ تو بندھے ہوں گے نہیں جو اس کی کمائی کا اندازہ لگایا جا

سکے۔ یہ تو دل والوں کا سودا ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کوئی کیا دے بیٹھے۔"

آخر میں کملا اٹھلا کر بولی "کیوں بے چاری پر الزام لگا رہی ہو تم لوگوں نے کیا اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟"

"ارے رام چھی چھی، بھگوان نہ کرے ایسا ملیچھ کام ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔" اُما دیوی دوبارہ بولیں۔

"اے ہے یہ تو بڑی سیدھی ہیں۔ بالکل سادھو ہیں، سادھو۔"

"سادھو کیوں دیوی کہو نا۔" اس پر سب کا بھرپور قہقہہ بلند ہوا۔

پھر ایک آواز اُبھری "وکیل صاحب کے بیٹے کی شادی ہوئی تھی تو اُن کے کمرے میں اپنی کھڑکی سے کوئی اور جھانکا کرتا تھا کیا؟"

سریتا بھٹناگر اپنی ساری کا پلو کمر کے گرد کستے ہوئے بولیں "بھئی میں نے تو کئی بار تو ہ لی ان کے گھر بھی گئی ہمیشہ یہی دیکھا ماں چولھا چکی کرتی رہتی ہے اور بیٹی باہر گھومتی پھرتی ہے۔"

"بہت ہوگئی بکواس اب ختم کرو اس کسّے کو تین مہینے سے ماں بیٹی کی کہانیاں سنتے سنتے کان پک گئے ہیں۔ کوئی اور بات کرو۔" سرلا نے کھسیا کر کہا تو سب خاموش ہو کر ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگیں۔

گلی کا یہ نکڑ جہاں پانی کا نل لگا ہوا تھا کالونی کی دیوار سے ملحق تھا۔ اندر کالونی میں کچھ سیمنٹ کی بنچیں بنی ہوئی تھیں۔ روزانہ شام کو محلے کی عورتیں وہاں پر جمع ہو جاتیں، کچھ بنچوں پر بیٹھ جاتیں اور کچھ وہیں گھاس پر بیٹھی بیٹھی کڑھائی بنائی کیا کرتیں۔ ایک دوسرے سے مشورے کرتیں کسی کا بچہ بیمار ہے، تو کسی کو کمر کا درد نہیں چھوڑتا تو کسی کو شوگر بڑھ گئی ہے۔ کس نے کس ڈاکٹر کو دکھلایا؟ پھر اپنے اپنے بچوں کا رونا ہوتیں۔ بچے ان کی سنتے ہی نہیں ادب لحاظ اُٹھ گیا ہے۔ کلجگ آگیا ہے... وغیرہ وغیرہ۔ کبھی کبھی چٹخارے لے لے کر فلموں اور ٹی وی سیریل کی باتیں بھی ہوا کرتیں۔ آج کل اس پنچایت کا محبوب موضوع ساوتری اور اس کی ماں تھیں۔ پانی بھرنے کا تو بہانہ تھا۔ وہ سب روزانہ شام کو

تفریح طبع کی خاطر ہی جمع ہوا کرتی تھی۔

آج پہلی تاریخ تھی۔ ساوتری نو بجے سے قبل ہی دفتر پہنچ گئی۔ ابھی آفس میں لوگ آئے بھی نہیں تھے۔ آہستہ آہستہ اسٹاف آتا گیا اور کام پر لگتا گیا۔ ہردیال بابو گیارہ بجے تشریف لائے تب انھوں نے منیجر کو طلب کر کے ساوتری کے بارے میں ہدایات دیں کہ ساوتری کو کیا کرنا ہے۔

وہاں کوئی خاص کام نہیں تھا۔ دن میں دو چار خط ٹائپ کرنا یا دو ایک باہر سے آئے ہوئے انگریزی خطوط کا ترجمہ بابوجی کو سنا دینا تھا۔ ہفتے کے پانچ دن بڑے مزے میں کٹ گئے۔ سنیچر کے دن دفتر میں جلد چھٹی ہو جاتی تھی بابوجی نے اپنے کمرے میں ساوتری کو طلب کیا اور بولے "آج سنیچر ہے جلد چھٹی ہو جائے گی مگر لنچ کے بعد کچھ اسٹاف رکے گا ــــ پینڈنگ کام سمیٹنا ہے اور تمھیں میرے پرسنل کام بھی سمجھنا ہیں۔ شام کو پلازہ ہوٹل میں میٹنگ ہے ڈنر وہیں کریں گے۔"

ساوتری نے عذر کیا "میرے ڈنر کی کیا ضرورت ہے؟"

بابوجی مسکرا کر بولے "میٹنگ میں دیر سویر ہوئی تو کیا تم بھوکی رہوگی؟"

غرضیکہ ساوتری دفتر بند ہونے کے بعد ان کے ساتھ ہوٹل پلازہ پہنچ گئی۔ ابھی تک اس نے اس ہوٹل کا نام ہی سنا تھا۔ کبھی اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ راہداری کے دبیز قالین پر سینڈل سمیت پیر رکھتے ہوئے اسے ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا اور وہ غیر شعوری طور پر بار بار اپنے سینڈلوں کی جانب دیکھ رہی تھی جن کی ایڑیاں قالین میں دھنسی جا رہی تھیں۔ بابوجی سیدھے اسے ڈائننگ ہال میں لے آئے اور ایک قبل سے ریزرو شدہ ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ جب وہ کھانے کا آرڈر دینے لگے تو ساوتری ہکلائی "سـ... سر اور سب لوگ کہاں ہیں؟"

"کون لوگ؟"

"جن کے ساتھ میٹنگ کرنا ہے۔"

"ہم تمھیں مجرے لگ رہے ہیں کیا؟" بابوجی مسکرا کر بولے "آجائیں گے سب آجائیں گے۔"

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بابوجی نے اُٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ سیدھے لفٹ کی جانب چل دیے۔ تیسری منزل پہ پہنچ کر ایک کمرے کے سامنے رُک کے اپنی جیب سے چابی نکالی اور دروازہ کھولتے ہوئے بولے۔

"آؤ اندر آجاؤ۔"

ساوتری کے منہ سے گھبراہٹ میں اتنا ہی نکل سکا "مگر سر...."

"ارے بھئی گھبرائے کیوں جا رہی ہو، میٹنگ یہیں ہوگی چلو اندر تو چلو۔"

وہ بادلِ ناخواستہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی چھٹی حس بیدار ہو چکی تھی۔ دل کی دھڑکن کی دھمک دماغ میں محسوس ہو رہی تھی۔

بابوجی نے کرسی کی جانب اشارہ کیا "بیٹھو" اور خود سامنے بچھی مسہری پر دراز ہو گئے۔

وہ ہونقوں کی طرح کرسی پر بیٹھی اُن کا منہ تکے جا رہی تھی۔ ہردیال بابو مسہری پر بیٹھے اسے کچھ ایسی میٹھی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے کسی زنجیر میں بندھے کتے کا راتب تام چینی کی پلیٹ میں سامنے رکھا ہو اور وہ اپنی بھوک مٹانے کے لیے پٹے کی زنجیر کھُلنے کا منتظر ہو۔

ساوتری لاشعوری طور پر پریشان نظریں ادھر اُدھر دوڑا رہی تھی۔ اُس نے اضطراری طور پر ہاتھ بڑھا کر سامنے ٹیبل پر رکھا ایک رسالہ اُٹھا لیا مگر دوسرے ہی لمحے رسالہ جھٹک کر یوں پرے پھینک دیا گویا اس میں بچھو کلبلا رہے ہوں۔ رسالہ عریاں تصاویر سے مزین تھا۔ خوف اور سراسیمگی کی ایک لہر اس کے وجود میں اُترتی چلی گئی اور وہ ہراساں نظروں سے بابوجی کو تکنے لگی۔

اتنے میں دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی۔ بابوجی کی کم اِن کی آواز کے ساتھ ہی بیرہ اندر داخل ہوا اور اس نے ٹیبل پر بوتل اور گلاس لگانا شروع کر دیے۔ پھر بابوجی سے دریافت کیا "اور کوئی چیز جناب؟"

ہردیال جی نے جواب میں کہا "نو" بیرہ اُلٹے قدم واپس چلا گیا دروازہ پھر بند ہو گیا۔

کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی اور ساوتری سوچ رہی تھی میری نوکری لگنے کے بعد ماں کتنی خوش تھی جیسے مجھے سورگ کی راہ مل گئی ہو مگر ایسا لگ رہا ہے اس سورگ کا راستہ نرک کی اور سے ہو کر گزرتا ہے۔ بابوجی تو کہہ رہے تھے یہاں میٹنگ ہوگی مگر ابھی تک کسی کا پتہ بھی نہیں ہے۔ ہو نہ ہو کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ یہ بوتلیں اور گلاس.... اس کا مطلب ہے بابوجی مکاری سے بہانہ بنا کر مجھے یہاں لائے ہیں۔ اوہو۔ اب میں سمجھی اس روز بابوجی کی بیٹی مجھے دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرائی کیوں تھیں؟ تو کیا... تو کیا...؟ نہیں ہرگز نہیں میں اپنی جان دے دوں گی مگر خود کو ان کی واسنا کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گی۔ اس نے ایک گہری سانس بھری اور اپنی قوتِ مدافعت کو جمع کرنے لگی۔

اچانک اس گمبھیر خاموشی میں بابوجی کی آواز لہرائی "ساوتری... شاید تمھیں تو ان سب چیزوں کی عادت نہیں ہوگی پر کبھی کبھی ہلکے سرور کے لیے کیا حرج ہے؟ آؤ دو گھونٹ لے لو۔"

اب تک بھی ہر حملے کے لیے تیار تھا اور اپنے پر تولنے کی سوچ رہا تھا کہ اس سکوت میں بوتل کے کھلنے کی آواز گونجی "ٹاک" جیسے بابوجی نے فائر داغ دیا ہو۔ ساوتری اچھل پڑی اور نہیں... کی بیساختہ چیخ کے ساتھ وہ کرسی پر سے اچانک یوں کھڑی ہوگئی گویا کرسی میں اسپرنگ نکل آئے ہوں۔ ساتھ ہی وہ روہانسی ہو کر بولی "مجھے جانے دیجیے پلیز..."

"پاگل نہ بنو سب آتے ہی ہوں گے۔" ہردیال جی کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

وہ سہم کر رہ گئی۔

بابوجی پھر غرائے "اِدھر آؤ میرے پاس۔"

وہ ایک مقناطیسی کشش کے ساتھ آواز کی جانب بڑھتی چلی گئی۔

"یہاں بیٹھو میرے پاس اور کچھ سیکھنے کی کوشش کرو کہ سوسائٹی کیسے مین ٹین کی جاتی ہے۔"

وہ مسہری کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ اس کا دل بارش میں بھیگے اور سردی سے ٹھٹھرے کسی پرندے کی طرح لرز رہا تھا۔ بابوجی نے گلاس چڑھانا شروع کر دیا۔ پورا گلاس ختم کرنے کے بعد وہ اسے مخمور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے "تم پرسنل سکریٹری ہو تمھیں سب کچھ

سیکھنا چاہیے۔ آج ہم ہیں کل کسی اور سے بھی پالا پڑ سکتا ہے۔ آخر اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟" پھر انھوں نے اسے سمجھانا شروع کر دیا "دیکھو آج کل اتنی اچھی سروس یوں ہی نہیں مل جاتی کچھ پانے کے لیے کچھ نہ کچھ کھونا ضروری ہوتا ہے۔ میں نے تو تمھیں ایک نگاہ دیکھتے ہی تاڑ لیا تھا تم بہت ترقی کرو گی"۔ یہ کہتے کہتے وہ اچانک سرک کر اس کے نزدیک آ گئے اور اس کا ہاتھ تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

"تڑاخ" کی ایک آواز کے ساتھ بابو ہر دیال کا گال جو شراب کی تندی سے گلابی ہو رہا تھا گلنار ہو گیا۔ اس سے قبل کہ بابو جی کوئی کارروائی کریں ساوتری نے ہرنی کی طرح زقند بھری اور دروازہ کھول کر چوکڑیاں بھرتی تمام زینے پار کر گئی۔ گھبراہٹ اور جلدی میں وہ لفٹ کو بھی نظر انداز کر گئی۔ جب وہ نیچے پہنچی تو اس کا سینہ بُری طرح پھول پچک رہا تھا۔ ساری اس کے شانوں پر سے ڈھلکی ہوئی تھی۔ دربان اس کی حالت کو دیکھ کر پُر معنی انداز میں مُسکرا دیا۔

آج سول ہسپتال میں ساوتری کا پورا محلّہ اُمڈا ہوا تھا۔ چنڈال چوکڑی بھی موجود تھی۔ اُوما دیوی کا بڑا لڑکا سائیکل چلاتے ہوئے بس کے نیچے آ گیا تھا۔ آپریشن کی ضرورت تھی لیکن آپریشن میں تاخیر ہو رہی تھی کیوں کہ اس کا بلڈ گروپ اے بی نگیٹیو تھا۔ یہ گروپ خال خال ہی ہوتا ہے مشکل سے ملتا ہے۔ آپریشن میں تاخیر ہونے سے جان بھی جا سکتی تھی۔ لڑکے کے لیے لمحہ بہ لمحہ خطرہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ فضا میں عجیب سی گمبھیرتا چھائی ہوئی تھی۔ لوگ منہ لٹکائے کھڑے تھے۔ اوما دیوی مسلسل روئے جا رہی تھیں۔ اُن کے ساتھ کی عورتیں ان کو دلاسہ دیتے ہوئے دکھ کے اظہار کے لیے طرح طرح کے منہ بنا رہی تھیں کیوں کہ جب دل ہی ساتھ نہ دے تو ایکٹنگ بھی نیچرل نہیں ہو سکتی۔ ماحول میں لوگوں کی گفتگو کی ہلکی ہلکی بھنبھناہٹ گونج رہی تھی۔ کچھ لوگ سرجن کے کمرے کے ارد گرد چکر لگا رہے تھے۔ اچانک سامنے سے ساوتری آتی ہوئی دکھلائی دی۔ سریتا بھٹناگر نے دیکھتے ہی منہ بنایا "اوہو! انھیں بھی خبر ہو گئی۔ کیوں نہ ہو محلّے کا جو معاملہ ہے۔ ہمدردی تو جتلانا ہو گی ہی"۔

اتنے میں ساوتری قریب آگئی۔ اپنے محلّے کے لوگوں کو جمع دیکھ کر بولی "کیا ماجرا ہے کیا ہوا؟"

"تمھیں نہیں معلوم اوما دیوی کا بیٹا گھنشیام بس کے نیچے آگیا ہے بڑے خطرے میں ہے۔" بملا ٹھاکر نے کہا

ساوتری نے استفسار کیا "آپریشن ہوگیا کیا؟"

"نہیں۔ بلڈ نہیں مل رہا ہے۔ ڈاکٹر کوشش کر رہے ہیں۔ اے بی نگیٹیو کا بلڈ گروپ مشکل سے ہی ملتا ہے۔"

"اے بی نگیٹو گروپ ہے بلڈ کا؟" ساوتری تقریباً چیخ کر بولی "ارے یہ تو میرا بھی گروپ ہے۔"

ساوتری کی بات سن کر اوما دیوی کی سسکیوں اور آہوں کا فضا میں پھیلتا ہوا ارتعاش رک گیا ——— ہکلا کر بولیں ...... "بیٹی کیا تم.....تم.....؟"

اس سے قبل کہ وہ جملہ مکمل کریں۔ ساوتری نے اثبات میں اپنی گردن دوبارہ ہلائی اور بغیر کچھ کہے وہ سیدھی سرجن کے کمرے میں چلی گئی۔

دو گھنٹے کے اندر سب کام ختم ہوگیا۔ گھنشیام کو او ٹی آر سے باہر لایا جا چکا تھا اب وہ اپنے بیڈ پر سو رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس سے بات چیت کرنے کو منع کر دیا تھا۔

ادھر ساوتری کے بیڈ کے گرد پوری پنچایت جمع تھی۔ اوما دیوی دودھ کا گلاس لیے کھڑی تھیں۔ بڑے پیار سے بولیں۔

"بیٹی اٹھو۔ یہ دودھ پی لو۔"

اوشا کرن سے برداشت نہ ہوا انھوں نے ساوتری سے پوچھ ہی لیا

"جب تمھیں ایکسیڈنٹ کا معلوم ہی نہیں تھا تو یہاں کیوں آئی تھیں؟"

ساوتری نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے جواب دیا۔

"میں یہاں اکثر آتی رہتی ہوں۔"

ایک بڑی لمبی سی کیوں ...... سنائی دی۔

"کیوں کہ میں اپنا خون فروخت کرتی ہوں۔ یہی میرا روزگار ہے۔"

بھوک کا شکنجہ

جب فاطمہ بی بی کے سامنے ٹرے میں گرم گرم بھات، شوربہ، دال اور کدو کی بھاجی آئی تو ان کی تو باچھیں ہی کھل گئیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ دو روز کی فاقہ کشی کے بعد اچانک عین دوپہر کو کھانے کے وقت روزہ کشائی گرما گرم کھانے سے ہوگی۔ انھوں نے اپنی ملگجی آنکھوں سے اسٹول پر رکھی ہوئی ٹرے کو جھک کر اچھی طرح سے دیکھنا چاہا تو چاولوں سے اُٹھتی ہوئی گرم بھاپ تیر کی طرح ان کے نتھنوں میں گھُستی چلی گئی اور بے اختیارانہ ان کے منہ سے خوشی کی ایک قلقاری نکل گئی۔

مگر اچانک کسی خیال سے ان کے دماغ پر یاسیت چھا گئی اور وہ بڑی حسرت سے اپنی کھوئی کھوئی آنکھوں سے اس کھانے کو تکنے لگیں۔ غیر شعوری طور پر ان کی گرفت کھانے کی ٹرے پر مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی اور وہ سحر زدہ سی اپنی کانپتی ہوئی ٹانگوں کو لرزنے سے روکنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھیں کہ ایک نرس کا ادھر سے گذر ہوا اور اس نے ڈپٹ کر کہا۔

"اے بڑھیا کیا کر رہی ہے۔ کھانا کیوں نہیں کھا لیتی یوں ہی ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

فاطمہ بی بی نے بے اختیاری میں نرس کا ہاتھ تھام لیا اور بولیں

"میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

نرس نے بڑی نخوت سے ان کی طرف دیکھا اور کرخت لہجے میں بولی

"تجھ سے پیسے دینے کو کون بولتا ہے خواہ مخواہ بدنام کرتی ہے یہ کھانا تو مفت ہے۔"

اور ''کھانا مُفت ہے''، ''کھانا مُفت ہے''، ''کھانا مفت ہے...'' کی بازگشت فاطمہ بی بی کے کانوں کے گرد طواف کرتی رہی دراصل انھیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا کہ قسمت اس طرح بھی مہربان ہوسکتی ہے۔ انھوں نے گھبرا کر نرس سے پوچھا ''تو کیا میں کھانا کھالوں؟''

نرس نے جھنجلا کر کہا۔

''ہاں ہاں کھاؤ نا روکا کس نے ہے تمھیں''۔ نرس کی آواز سنتے ہی فاطمہ بی بی کی آنکھوں میں چمک دوڑ گئی اور ان کے کمزور فاقہ زدہ ہاتھ باز کے مضبوط پنجوں کی طرح کھانے کی طرف لپکے مگر وہاں کسی قسم کی مزاحمت تو تھی نہیں کہ کھانے میں دشواری ہوتی وہاں تو سیدھے سادے اُبلے ہوئے چاول اور ترکاری تھی۔

ایک بار وہ مغلوبہ مٹھی کے شکنجے میں پھنستا تو سیدھا حلق کی راہ پیٹ کے اندھے کنوئیں میں دھنستا چلا جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا تھال خالی ہوگیا تھال سے منہ لگا کر فاطمہ بی بی نے بچی کھچی دال بھی غٹ سے چڑھالی اور پھر پانی کی تلاش میں ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔

ہسپتال کی پوری گیلری میں بیڈ ہی بیڈ تھے اور ان کے پاس اسٹول رکھے تھے جن پر کچھ عورتیں بیٹھی اب بھی کھانا کھا رہی تھیں۔

پاس سے گزرتی ہوئی نرس کو انھوں نے روک کر پوچھا۔

''کیا پانی مل سکتا ہے؟'' نرس نے قہر آلود نگاہوں سے انھیں دیکھا اور ان سے بولی ''ہم کیا تمھارے نوکر ہیں جو پانی بھی لا کر دیں۔ باہر نل لگا ہوا ہے خود جا کر پانی پی لو''۔

فاطمہ بی بی پانی پی کر لوٹیں تب بھی ماجرا ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

کمالو کے باپ کو مرے ہوئے سال بھر بیت چکا تھا۔ انھیں تو یاد نہیں پڑ رہا تھا کہ اس پورے سال میں انھوں نے اتنا سیر ہو کر کبھی کھانا کھایا ہو۔ ویسے اس پورے عرصے میں انھوں نے کیا کیا جتن نہیں کیے تھے۔ لوگوں کے برتن صاف کیے جھاڑو دی، بھیک مانگی عید بقر عید شب برات غرضیکہ سبھی تہواروں پر لوگوں کے گھر گھر جا کر کھانا مانگا مگر اتنے اہتمام

کے ساتھ گرم گرم کھانا انھیں آج پہلی بار میسر ہوا تھا۔ بھیک میں کبھی کہیں سے کچھ چاول مل جاتے تو کہیں سے باسی روٹی وہ بھی بغیر ترکاری کے اور کبھی کوئی شخص پانچ یا دس پیسے کا سکہ ہاتھ پر رکھ دیتا اور نہ زیادہ تر لوگ تو معافی ہی چاہ لیا کرتے تھے۔

جھاڑو برتن کرتے کرتے تو ان کے ہاتھ گھس جاتے مگر دن بھر مشقت کرنے کے باوجود انھیں اور ان کے بیٹے کالو کو ایک وقت کا بھی پیٹ بھر کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بھیک کی طرف مائل ہوئیں کیوں کہ کام کرنے سے بھیک مانگنے کا دھندہ منفعت بخش تھا۔

جب پیٹ بھر گیا اور کھانا ہضم ہونے لگا تو انھیں یاد آیا کہ محلے میں خاں صاحب نے اپنے بیٹے کی موت پر کئی بار کھانا بانٹا تھا اور تین روز تک ان کے دروازے پر فقیروں کی بھیڑ لگی رہی تھی۔ ایک روز بڑی مشکل سے وہ بھی وہاں سے گملا بھر کر پلاؤ لائی تھیں جسے انھوں نے اور کالو نے مزے لے لے کر کھایا تھا اس خیال کے آتے ہی وہ نزدیک کے بیڈ کی عورت کو مخاطب کر کے بولیں۔

"بوا یہاں کون مر گیا ہے؟" وہ بیچاری کھانا کھا رہی تھی بولی۔

"مجھے تو معلوم نہیں ادھر کے وارڈ میں تو کئی روز سے کسی کی موت نہیں ہوئی۔ بات کیا ہے؟"

فاطمہ بی بی اپنا سر کھجاتے ہوئے بولیں۔

"یہ کھانا جو سب میں تقسیم ہوا ہے میں اس کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ مرنے والے کے عزیز رشتے دار سے کہتی کہ میں ایک غریب بے سہارا ہوں۔ شاید وہ کچھ کپڑے لتے بھی مجھے دے دیتے۔"

وہ عورت فاطمہ بی بی کو ہونقوں کی طرح دیکھتی ہوئی بولی۔

"میں سمجھی نہیں تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

فاطمہ بی بی نے دوبارہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا

"بوا یہاں جو سب لوگ بیٹھے مفت کا کھانا کھا رہے ہیں، میں پوچھ رہی ہوں کہ آخر کون

مر گیا ہے اور کس کی طرف سے یہ کھانا بانٹا گیا ہے ؟ ''

اس عورت کی سمجھ میں اب پوری بات آئی تو وہ مسکرا کر بولی ۔

'' مرا ورا کوئی نہیں یہ کسی کے مرنے کا کھانا نہیں ہے ۔ یہ تو ہسپتال کا کھانا ہے ۔ اس ہسپتال میں مریض کے علاوہ اس کے ساتھ والے آدمی کو بھی کھانا ملتا ہے ۔ دیکھ نہیں رہی ہو انگریز میمیں یہاں پر چل پھر رہی ہیں ۔ ڈائریا کے علاج کا ہسپتال میں مخصوص انتظام ہے ۔ اس ہسپتال میں باہر والوں کا دخل ہے ۔ ''

'' تو کیا یہاں کھانا تینوں ٹیم ملتا ہے ؟ ''

'' ہاں ہاں تینوں ٹیم ہی ملتا ہے ۔ ''

یہ سنتے ہی فاطمہ بی بی ایک عجیب سوچ میں گم ہو گئیں گویا کہہ رہی ہوں کالو تیرے باپ کو گزرے ہوئے ایک سال ہو گیا اور تجھے ڈائریا اب ہوا ہے ۔ اس درمیان میں تو نے اور میں نے نہ جانے کتنے فاقے کر ڈالے ۔

ایک ہفتہ کیسے گزر گیا اور ان کا کالو کب بھلا چنگا ہو گیا فاطمہ بی بی کو خبر تک نہ ہوئی ۔ ان کی آنکھ تو اس وقت کھلی جب ڈاکٹر نے انھیں بتایا کہ آپ کا بیٹا ٹھیک ہو گیا ہے اور ہم نے اس کی ہسپتال سے چھٹی کر دی ہے اس لیے اس کو یہاں سے لے جائیے

ڈاکٹر کے منہ سے اچانک گھر جانے کی بات سن کر فاطمہ بی بی سٹ پٹا کر رہ گئیں انھوں نے تو یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ کالو جوں جوں ٹھیک ہو رہا ہے توں توں ان کی فاقہ زدگی بھی اپنا بھیانک منہ کھولے ان سے قریب ہوتی جا رہی ہے ۔

ڈاکٹر جا چکا تھا ۔ انھوں نے نرس کے سامنے بہت ہاتھ پیر مارے مگر نرس نے انھیں ڈسچارج سلپ تھما دی اور ان کے بیٹے کا کاندھا پکڑ کر وارڈ سے باہر لے آئی ۔

بڑی بی جب گھر پہنچیں تو بھوک کی کہانی پھر سے شروع ہو چکی تھی ۔

انھوں نے ہاتھ میں پیالہ تھاما اور وہ بھیک مانگنے نکل کھڑی ہوئیں اور جب وہ واپس گھر میں داخل ہوئیں تو پیالے میں کچھ چاول تھے دو باسی روٹیاں تھیں اور ڈیڑھ روپے کی ریزگاری جمع تھی ۔

اسی طرح چار پانچ روز کٹ گئے۔ باسی روٹیاں کھا کھا کر کالو نے شکایت شروع کر دی تھی۔ ماں میرے پیٹ میں بہت درد ہے۔ بڑھیا بیچاری کر بھی کیا سکتی تھی۔ دوسرے روز کالو کی طبیعت پھر خراب ہوگئی اور جب شام کو فاطمہ بی بی پڑوس میں پہنچیں تو کالو ادھ مرا سا کھاٹ پر پڑا ہوا تھا اس کی حالت دیکھ کر فاطمہ بی بی پڑوس میں پہنچیں کہ کوئی دوا لے آئے تو محلے کی عورتوں نے دیکھتے ہی کہا کہ کالو کو پھر ہسپتال لے جاؤ۔

ہسپتال کا نام سنتے ہی بڑی بی کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو یکلخت تھم گئے اور ان کے مرجھائے ہوئے چہرے پر خوشی دمکنے لگی پھر لاشعوری طور پر کھاٹ پر جھک کر انھوں نے اپنے کالو کو کئی بار پیار کر ڈالا اور سرور بھری آواز میں پاس کھڑی عورت سے بولیں "بوا ذرا رکشے تک میرے کالو کو پکڑ کر پہنچا دو" اس طرح ایک بار پھر قدرت نے بڑھیا کے کھانے پینے کا انتظام کر دیا۔ اب ہسپتال میں فاطمہ بی بی کے پھر وہی ٹھاٹ تھے نہ کوئی فکر نہ چنتا انھیں آرام کے ساتھ تینوں وقت کھانا مل رہا تھا اور حسب ضرورت ان کے کالو کو بھی۔

مگر پھر ان کا کالو اچھا ہو گیا۔ اس کی صحت نے بڑی بی کو ذہنی طور پر بیمار کر دیا اور وہ ہسپتال کے باہر کھڑی اپنے کالو کا ہاتھ تھامے ڈسچارج سلپ کو نفرت سے دیکھ رہی تھیں گھوم پھر کر انھوں نے ہسپتال کی عالیشان عمارت کو دیکھا تو ان کے منہ سے ایک سرد آہ نکل گئی۔ پھر خالی خالی نگاہوں سے سڑک کے ہجوم کو دیر تک تکتی رہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون سا راستہ اُن کے گھر کی طرف جاتا ہے۔

اچانک اُن کے دماغ میں ایک کوندا سا لپکا اور ذہن نئے تانے بانے بُننے میں مصروف ہو گیا۔ چند ہی لمحوں میں ان کے چہرے سے خوشی کی کرنیں پھوٹ پڑیں اور انھوں نے مسکرا کر نیچے زمین پر بیٹھے ہوئے کالو کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا اور بڑی نفرت کے ساتھ ڈسچارج سلپ کے پُرزے پُرزے کر کے اسے زمین پر پٹخ دیا گویا اُن کے سُکھ چین کے خاتمے کا ذمے دار یہی پروانہ تھا۔ انھوں نے کالو کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر کی راہ لی۔

گھر آ کر ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس اثنا میں وہ کالو پر اپنے سارے داؤں آزما چکی

تھیں پر کالو ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ اس مرتبہ ہسپتال والوں نے اُسے نہ جانے کون سی جادو کی دوا کھلا دی تھی کہ وہ باسی تو کیا سوکھی روٹیاں تک ہضم کیے جا رہا تھا۔

روز شام کو فاطمہ بی بی ایک نئی آس کے ساتھ گھر میں داخل ہوتیں کہ آج تو ضرور کالو کا پیٹ خراب ہو گیا ہو گا مگر قسمت نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔

جب تقدیر ہی خراب ہو تو تدبیر کی بھلا کب چلتی ہے مگر فاطمہ بی بی بھی آسانی سے ہار مان لینے والی نہیں تھیں۔ جب سڑی بوسی چیزیں اور سوکھی روٹیاں تک کالو ہضم کرتا چلا گیا تو وہ بھی اپنی دن بھر کی پونجی لے کر حکیم صاحب کے پاس پہنچ گئیں اور ان سے بولیں۔

"پیٹ صاف کرنے کی کوئی دوا ہے تمھارے پاس؟"

حکیم صاحب نے اپنے حقّے کی نے کو منہ سے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے کیا پیٹ میں درد ہے تمھارے؟"

وہ بولیں "ارے نہیں بھیا مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ میرے بچّے کو کوئی سات آٹھ دن سے قبض کی شکایت ہے، وہ بستر پر پڑا ہے کوئی ایسا نسخہ دیجیے کہ پیٹ کی صفائی ہو جائے۔"

حکیم صاحب نے اپنی ناک کی پھننگ پر ٹکے ہوئے چشمے کی اوٹ سے بڑی بی کو دیکھا اور لمبی 'ہوں' کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے اور سامنے بریکیٹ میں رکھے زنگ آلود ٹین کے ڈبوں میں سے کسی قسم کی جڑی بوٹیاں نکال کر ایک کاغذ میں باندھیں اور بولے۔

"لو اسے اوٹا کر صبح سویرے پلا دینا۔ پھر ایک گھنٹے بعد ناشتہ دینا۔ دوا کے دو روپے ہوئے۔"

فاطمہ بی بی نے فوراً پلو کھول دو روپے حکیم صاحب کو گن دیے اور گھر کی راہ لی۔

صبح اُٹھتے ہی انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ حکیم صاحب کی دوا اوٹا کر بیٹے کو پلا دی اور پھر باسی روٹی کا ناشتہ کھلا کر وہ پیالہ لے اپنے کام پر نکل کھڑی ہوئیں۔

تھکی ہاری اپنے خیالات میں گم بڑی بی جب شام گھر پہنچیں تو بیٹے کو دیکھتے ہی ان کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ کالو کا چہرہ پیلا پڑ چکا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے

تھے اور سارے کپڑے خراب ہو چکے تھے اور وہ آنکھیں بند کیے سکڑا ہوا گٹھڑی بنا پڑا تھا بے اختیار انھوں نے اُسے کئی آوازیں دیں۔ ہلایا جُلایا تو کالو نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں مگر پھر اس پر غشی طاری ہوگئی۔

فاطمہ بی بی اُلٹے قدم گلی میں دوڑیں اور نکڑ سے ایک رکشے والے کو بلایا۔ اس کی مدد سے کالو کو لے کر ہسپتال پہنچ گئیں۔

ہسپتال میں فوری طور پر کالو کی جان بچانے کی تدبیریں شروع ہوگئیں۔ سلائن دی گئی۔ انجکشن لگائے گئے دوائیں دی گئیں مگر کالو کی غشی قائم رہی اور انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ کالو کی جان خطرے میں ہے اور اگلے چوبیس گھنٹے تک کچھ کہا نہیں جاسکتا تو ان کے اوسان خطا ہوگئے اور انھوں نے بے اختیار ہو کر نرس کے ایپرن کا پلّو پکڑ لیا اور رو رو کر کہنے لگیں "میرے بچے، میرے لعل کو، بچالو اس کے سوا دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔"

نرس نے ایک جھٹکے سے اپنے دامن کو چھڑایا۔ بڑی بی کی میلی انگلیوں کے نشان اس کے سفید ایپرن پر نمایاں ہوگئے تھے۔ اس نے کھسیا کر اپنے دودھ جیسے لباس پر پڑے ہوئے داغ کو دیکھا اور غصّے بھرے لہجے میں بولی۔

"اندھی ہو کیا دیکھ نہیں رہی ہو ہم پوری کوشش کر رہے ہیں" اور بڑبڑاتی ہوئی دوسرے وارڈ میں چلی گئی۔ فاطمہ بی بی نے ساری رات کالو کے بیڈ کے پاس اسٹول پر بیٹھے بیٹھے آنکھوں میں کاٹ دی۔

صبح کے ساتھ وارڈ میں چہل پہل بھی بڑھ گئی تھی مگر کالو کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ جب ان کی ناک میں بھات کی گرم گرم بھاپ سے اُٹھتی ہوئی خوشبو پہنچی تو خود کار مشین کی طرح اُن کے نتھنے پھولنے اور پچکنے لگے اور ان کا لاشعور اس کھانے کی ٹرے سے اُٹھتی ہوئی ملی جلی خوشبو کو اپنے اندر سمونے میں مصروف ہوگیا۔

پھر ان کے ذہن نے کروٹ لی اور انھیں احساس ہوا کہ وہ گذشتہ دس دن سے اسی خوشبو کے لیے توجان توڑ کوشش کر رہی تھیں۔ بے اختیار ہو کر انھوں نے کھانے کی ٹرے کو اُٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اس سے قبل کہ وہ کھانا شروع کرتیں۔

نرس آ پہنچی کیوں کہ سلائن ختم ہو رہی تھی اور اسے کالو کو نئی سلائن لگانی تھی۔ ادھر کالو اب دم توڑ رہا تھا نرس فوراً ڈاکٹر کے پاس دوڑی۔

آن کی آن میں کالو کی گردن ایک جانب لڑھک گئی۔

فاطمہ بی بی کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلی اور انھوں نے اپنے بیٹے کو چھاتی سے لگانے کے لیے اسٹول پر سے اُٹھنا چاہا تو توازن برقرار نہ رکھ سکیں اور فرش پر آ رہیں ٹرے کا پورا کھانا ان کے جسم پر بکھر گیا۔ وہ بیہوش ہو کر گہری گہری سانسیں لینے لگیں مگر کھانے کی خالی ٹرے کا کونہ اب بھی ان کے ہاتھ کی انگلیوں میں جکڑا ہوا تھا اور نرس بڑی کوشش کے باوجود ان کے شکنجے میں جکڑی ہوئی کھانے کی ٹرے کو آزاد نہیں کرا پا رہی تھی۔

جھوٹے سپنے سچے خواب

جب چلتے چلتے کافی دیر ہوگئی تو خالد نے کریم لالہ کو مخاطب کیا۔ "لالہ کچھ دیر بیٹھ کر سستا لیجیے۔ سب کافی تھک گئے ہیں"۔ اس سے قبل کہ کریم لالہ کچھ بولیں ان کے ساتھی دلاور نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ "ہاں لالہ! اب گٹھڑی لے کر نہیں چلا جا رہا تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جائیے۔"

جواب میں لالہ مسکرائے "تم کیسے جوان مرد ہو اتنی جلدی بول گئے یوں خالی بیٹھ کر وقت برباد کرنے سے کیا فائدہ ہمت کر کے چلتے رہو آگے کسی ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پانی کریں گے تو آرام بھی ہو جائے گا۔" اس کے ساتھ ہی کریم لالہ نے پاس والی بلڈنگ کی جانب منہ کر کے ہانک لگائی "کشمیر والا، شال والا، شالیں لے لو عمدہ اور سستی شالیں۔"

اسی وقت نزدیک سے گزرتے ایک بنگالی بابو نے لالہ کے کاندھے پر لٹکتی شالوں کو غور سے دیکھا اور آگے بڑھ کر ڈیزائن کا معائنہ کرنے لگا۔ گاہک کی توجہ پاتے ہی لالہ کی زبان فراٹے بھرنے لگی "صاحب! ہمارے پاس ایک سے ایک گرم اور نہایت ہی نرم و ملائم شالیں ہیں جن کو بڑے بڑے نواب، زمیندار، جاگیردار استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ معمولی آدمی ان کو اوڑھ کر پارٹی میں چلا جائے تو اس کا روپ بدل جائے۔ نواب زمیندار نظر آئے۔ بیل بوٹے کناری اتنی خوبصورت جو دیکھے دیکھتا رہ جائے۔ نہایت سستی اور نئے فیشن کی شالیں ہیں۔ صاحب ہم لوگ

آپ کی خدمت کے لیے کشمیر سے مال لاتے ہیں۔ دیکھیے پسند کیجیے زنانی مردانی سب قسم کی ہیں۔

ابتو بے شی کو تھا بولو کینو، مال ٹا دے کھاؤ نا (اتنی زیادہ باتیں کیوں کرتے ہو مال دکھلاؤ نا)، بابو نے کریم لالہ کو مستفسرانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ہاں کیوں نہیں!'' اس سے قبل کہ لالہ خالد اور دلاور کو گٹھڑیاں کاندھے سے اُتارنے کو کہیں دونوں نے اپنی اپنی گٹھڑیاں دھما دھم فٹ پاتھ پر گرادیں اور بڑی پھرتی سے گٹھڑی میں بندھی گانٹھیں کھول کر مال سجانے لگے۔ بابو کے سودا کرتے کرتے کچھ اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔ ایک بھیڑ سی لگ گئی۔ سودے ہوتے رہے، مال فروخت ہوتا رہا۔ اسی طرح دو گھنٹے گزر گئے۔ ان دو گھنٹوں میں دس عدد شالیں فروخت ہو گئیں۔

کریم لالہ نے خالد اور دلاور کو مال سمیٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا ''چلو اب کسی ہوٹل میں چل کر کچھ ناشتہ کرلیں پھر آگے جائیں گے۔''

سارا دن اسی طرح گزرا جب خالد رات کو بستر پر لیٹا تو تھکن کی وجہ سے اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ وہ بڑبڑایا اس قدر مشقت اور اس کا پھل؟ پھر وہ خود ہی مسکرا دیا۔ اس کا پھل ہے شبنم کا حسین ساتھ محبت کی تکمیل! کہتے ہیں محبت کی راہیں بہت دشوار ہوتی ہیں اس راہ پر چلتے چلتے لوگ اپنی جان تک دے دیا کرتے ہیں۔ میں کیا کررہا ہوں صرف محنت ......؟ مشقت زیادہ ہو یا کم اس سے کیا فرق پڑتا ہے میری منزل تو قریب آتی جارہی ہے۔

پھر وہ بستر سے اُٹھا اور اپنا بیگ کھول کر شبنم کی تصویر نکال لایا۔ شبنم کے حسین چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی ساری تھکن یوں کافور ہوگئی جیسے کسی بچے کو اسکول سے واپسی پر آئس کریم مل جائے۔ تصویر خالد سے باتیں کرنے لگی۔

خالد!

ہوں،

کیا سوچ رہے ہو؟

میں سوچ رہا ہوں کوئی ایسا لوشن تلاش کر کے تمھارے چہرے پہ مل دوں جس سے تمھارا چہرہ برس دو برس کے لیے سیاہ فام ہو جائے۔

کیوں؟ بھلا تمھیں میرے گورے رنگ سے چڑ کیوں ہو گئی؟

چڑ نہیں محبت ہو گئی ہے۔

یہ کیسی محبت ہے جو تم میرے چہرے کا ستیا ناس کر دینا چاہتے ہو۔

شبنم! مجھے تمھارے چہرے کی شادابی سے ڈر لگتا ہے۔

اچھا! شبنم نے اسے شوخی سے دیکھا۔

ہاں تمھارے عارض پہ کھلے گلابوں سے ڈر لگتا ہے۔ تمھارے ہونٹوں کی ان گلابی پنکھڑیوں کو دیکھ کر جی ڈرتا ہے، مجھے تمھارے....

بس بس! شبنم بہت زور سے ہنسی۔ خالد کہیں تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔ کل تک تو تم میرے حسن کی مدح سرائی میں دیوانے نظر آتے تھے اور آج مجھے چڑیل بنانے پر تلے ہوئے ہو۔ کیا جنون نے تمھیں بالکل ہی دیوانہ بنا دیا ہے۔

ہاں، میں جنونی ہوں، سودائی ہوں تمھارے حسن کا۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بھنورا ان گلابوں کی مہک پا کر تمھارے نزدیک آئے اور اس چمن زار کے سائے میں جینے کی آرزو کرے۔

تو تم زمانے سے ڈرتے ہو، شبنم نے شوخی سے آنکھیں نکالیں۔

ہاں میں ڈرتا ہوں شبنم! تم میری زندگی ہو، میرا سرمایۂ حیات ہو، میری دولت ہو۔ کون نہیں چاہتا کہ وہ اپنی دولت کی حفاظت کے لیے اسے زمانے کی نگاہوں سے بچا کر رکھے۔ میرا بس چلے تو میں تمھیں اپنے کلیجے میں چھپا لوں۔ خالد جذباتی ہو گیا۔

"تو چھپا لو نا، کس نے تمھیں روکا ہے" شبنم نے اپنی گھنی پلکوں کے چھپر ایک ادا سے وا کرتے ہوئے دلنشین نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہے، ہے شبنم خدا کے لیے مجھے یوں پُر خمار نظروں سے نہ دیکھا کرو۔ یہ نشہ مجھ سے

برداشت نہیں ہوتا کہیں میں بہک نہ جاؤں"۔

شبنم کی ہنسی کی نقرئی گھنٹیوں کا ترنم فضا میں بکھر گیا۔ دیوانے تو ہو رہے ہو اور کتنا بہکو گے؟

"شبنم تم بہت نادان ہو۔ اپنے آپ سے بالکل بے خبر تمھیں نہیں معلوم کہ قدرت نے تمھیں کس آمیزے سے بنایا ہے؟"

"کس آمیزے سے بنایا ہے؟" شبنم اترا کر چہکی۔

قدرت نے طلوع ہوتے سورج کی کرنوں میں چاندنی اور مہکتے گلابوں کے ساتھ اوس کے موتیوں کو حل کر کے تمھارا آمیزہ تیار کیا ہوگا پھر اسے کسی بہشتی حور کے سانچے میں ڈھال کر خالق تمھارا یہ پیکر عالمِ وجود میں لایا ہوگا۔ یہ مومی مجسمہ جس کی قربت میں چمنستانوں کی مہک ہے، فردوس کے باغوں کی ٹھنڈک ہے، لیکن اس موم کے پتلے میں ایک لطیف آگ بھی پوشیدہ ہے جو کسی بھی ہستی کے خرمنِ حواس کو جلا کر خاک کر سکتی ہے۔

شبنم کھلکھلا کر ہنس پڑی "یہ آج تمھیں کیا ہو گیا ہے جو اول جلول بکے جا رہے ہو مجھے نہیں معلوم تھا تم اتنے لمبے لمبے ڈائیلاگ بھی بول سکتے ہو یہاں سری نگر میں بیکار مٹرگشت کرنے سے تو بہتر ہے کہ بمبئی چلے جاؤ کسی بھی فلم کمپنی میں ڈائیلاگ رائٹرنگ جاؤ گے"۔

"ہاں شبنم میں جا رہا ہوں۔" خالد نہایت سنجیدگی سے بولا۔

"کہاں بمبئی"؟

"نہیں بمبئی نہیں ویسٹ بنگال مزدوری کرنے"۔

"کیا..... ؟ کیا کہہ رہے ہو تم مجھے چھوڑ کر جاؤ گے"۔ شبنم نے حیرت ملی خشمگیں نظروں سے اُسے دیکھا۔

"ہاں کیا کروں مجبوری ہے۔ دو سال سے زائد ہو گئے اس بی۔ کام کی ڈگری کو لیے گھومتے ہوئے سری نگر کیا پورے کشمیر میں کام نہیں ملتا یہاں کے حالات روز بروز خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ والد صاحب نے کیا کیا امیدیں باندھی تھیں، مجھے تعلیم دلائی

تھی۔ اب وہ بھی بوڑھے ہو گئے ہیں۔ میں کب تک ان پر بوجھ بنا رہوں اور پھر میں ڈرتا ہوں تمھارے ابا میری بیکاری سے گھبرا کر تمھارا ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں نہ دے دیں۔ بھلا تم میں کیا کمی ہے۔ تعلیم یافتہ بھی ہو اور دیوانہ بنانے کی حد تک حسین بھی۔ کوئی بھی تمھیں پانے کی تمنا کر سکتا ہے۔"

"ویسٹ بنگال جا کر کیا کرو گے؟" شبنم نے استفسار کیا۔

"مزدوری۔"

"کیسی مزدوری؟"

"دراصل یہاں سرینگر سے کئی تاجر موسم سرما میں شالیں فروخت کرنے اندرونِ ہندوستان جاتے ہیں۔ وہ گھوم پھر کر مال فروخت کرتے ہیں تو ان کو مال بردار مزدوروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا میں نے یہاں کے ایک تاجر کریم لالہ سے بات طے کر لی ہے وہ مجھے ایک سو روپیہ یومیہ دیں گے جب کہ میرے دیگر اخراجات بھی اُن کے ذمہ ہوں گے تقریباً چھ ماہ کا یہ ٹور ہوتا ہے۔ چھ ماہ بعد تقریباً اٹھارہ ہزار کی رقم میرے پاس ہوگی تو پھر میں تمھارے ابا کے پاس تمھارا ہاتھ مانگنے جا سکوں گا ورنہ وہ مجھ جیسے نکمے کے ہاتھ میں تمھارا ہاتھ کبھی بھی نہیں دیں گے۔ جب بھی مجھ سے ملتے ہیں ان کا پہلا سوال یہی ہوتا ہے بیٹا کوئی کام دھندہ ملا؟ اور جب میں نفی میں اپنی گردن ہلاتا ہوں تو ان کی آنکھوں میں مایوسی کی سفیدی پھیل جاتی ہے اور میں شرمندہ ہو کر گردن جھکا لیتا ہوں۔ شبنم ذرا سوچو مجھے جانا ہی ہوگا۔"

"میں بھی تمھارے ساتھ جاؤں گی میں تمھارے بغیر یہاں کیسے رہوں گی؟"

"یہ کیسے ممکن ہے۔ تمھارے ابا تمھیں کبھی بھی جانے نہیں دیں گے اور نہ ہی کریم لالہ برداشت کریں گے کہ کوئی نازک اندام لڑکی ان کے ساتھ ہو انھیں مزدوروں کی ضرورت ہے جو بار برداری کر سکیں۔"

"میں بھی مزدوری کر لوں گی۔"

"پھر بیوقوفی کی باتیں کیں!" خالد نے آنکھیں نکالیں "اس طرح ضد کرو گی تو نہ تو

میں جا سکوں گا اور نہ ہی ہماری شادی ہو سکے گی۔ شبنم ذرا سوچو یہاں کا ماحول بہت خراب ہے تمھارے ابا کب تک انتظار کریں گے اور اگر انھوں نے گھبرا کر تمھارا ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں دے دیا تو میں تو کہیں کا نہ رہوں گا وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔"

شبنم سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ ٹکر ٹکر خالد کی صورت تکتی رہی اور اس کی خاموش سرگیں آنکھوں سے موتی ٹپک ٹپک کر اس کے عارض کے گلابوں پر پھسلتے اور نیچے گر گر کر چور ہوتے رہے۔

رفتہ رفتہ دن گزرتے رہے کریم لالہ روز صبح کام پر نکل جاتے۔ بالی گنج تو کبھی ٹالی گنج، کسی دن علی پور، تو دوسرے روز پارک سرکس، سیالدہ سے لے کر دم دم اور ہاوڑہ سے شیب پور تک۔ خالد بھی ساتھ جاتا۔ اسے حیرت ہوتی یہ کلکتہ شہر ہے یا سمندر جس کا سرا نظر نہیں آتا۔ وہ تمام دن آوازیں لگاتے، مال فروخت کرتے اور رات کو اپنے ڈیرے پہ واپس آجاتے۔ پھر جب خالد سونے کے لیے بستر پر دراز ہوتا تو شبنم اس کے خیالوں میں آجاتی۔ وہ اس سے باتیں کرتے کرتے سو جاتا۔

خدا خدا کر کے وہ دن بھی آیا جب کریم لالہ نے کوچ کا قصد کیا اور وہ سیالدہ اسٹیشن پہنچے۔ اور جب جموں توی ایکسپریس کے انجن نے روانگی کی وسل دی تو خالد کے چہرے پہ خوشی کے رنگ بکھر گئے۔ وہ ٹرین کے ساتھ دوڑتی اور آپس میں مل مل کر جدا ہوتی ریل کی پٹریوں کو محویت سے دیکھتا رہا یہ ملاپ اور جدائی کا کھیل اسے بہت اچھا لگا وہ بھی تو جدا ہو کر ملنے جا رہا تھا۔ یہ حقیقت ہے ملاپ کا مزہ جدائی کے بعد ہی ہے۔ محبت کی تصویر میں جب تک جدائی کا رنگ نہ بھرا جائے نکھار پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اسی قسم کی باتیں سوچتا رہا اور ٹرین دوڑتی رہی۔ اس کا سفر جوں جوں کم ہوتا جا رہا تھا دل کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ بار بار لالہ سے دریافت کرتا ہم سری نگر کب پہنچیں گے۔ لالہ اس کی دلی کیفیت کا اندازہ کرتے ہوئے مسکرا کر جواب دیتے "اتنے بے چین مت ہو میرے بچے انشاء اللہ پرسوں ہم جموں پہنچ جائیں گے اور پھر سری نگر کے لیے بس پکڑیں گے۔" خالد اپنی بے چین آنکھوں سے لالہ کی صورت تکتا اور خاموش ہو کر شبنم کے خیالوں میں کھو جاتا۔

شبنم سے ملاقات کے بعد وہ سب سے پہلے اسے سرخ جوڑا دکھلائے گا، نہیں روپہلا جھومر، نہیں کانوں کے بالے، یہ بھی نہیں وہ سب سے پہلے اس کی ریشمی کلائیوں میں سرخ چوڑیاں پہناتے گا وہ سب چیزیں دیکھ کر خوشی سے ناچنے لگے گی۔ نہیں وہ شاید اس سے مل کر شکوہ کرنے اور رونے لگے کہ اتنے دنوں بعد کیوں آئے ہو۔ وہ انتظار میں گھل گھل کر بے حال ہوگئی تھی۔

اچانک اس کے کانوں میں آوازیں آئیں۔ چائے گرم، پوری گرم، حلوہ پراٹھا مزیدار، اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ جاتا اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ریلوے پلیٹ فارم کی چہل پہل کو دیکھنے لگتا۔ کریم لالہ چائے والے کو آواز دیتے اور ایک چائے سے بھرا مٹی کا چھوٹا سا آبخورہ اس کی جانب بڑھا دیتے۔ وہ گرم چائے کا ایک گھونٹ لیتا اور کریم لالہ سے سوال کرتا یہ ٹرین بار بار رک کیوں جاتی ہے اب اور کتنا وقت لگے گا ہم کب پہنچیں گے؟

اس کے بچکانہ سوال کو سن کر سب ہنسنے لگتے۔ وہ خفیف ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا اور ایک بار پھر اپنے خیالوں میں کھو جاتا۔

اس طرح خوابوں سے آنکھ مچولی کھیلتا ہوا خالد جموں اسٹیشن پہنچ گیا۔ ٹرین لیٹ پہنچی۔ رات ہوگئی تھی۔ مشورہ ہوا رات ویٹنگ روم میں گزار کر کل صبح کی پہلی بس سے سرینگر روانہ ہو جائیں۔

ابھی وہ لوگ ناشتے سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ پلیٹ فارم کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی بموں کی مہیب آوازوں سے گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی رائفلوں کی دھائیں دھائیں اور اسٹین گنوں کی کرٹ کٹ کی آوازیں فضا میں منتشر ہونے لگیں۔ پلیٹ فارم پر بھگدڑ مچ گئی۔ جگہ جگہ پولیس کے سپاہی اور سیکورٹی گارڈ پوزیشن لینے لگے معلوم ہوا مجاہدین نے حملہ کر دیا ہے۔ دونوں جانب سے خودکار گنیں شعلہ برسانے لگیں۔ ان لوگوں نے سہم کر ویٹنگ روم کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر لیے۔ کچھ دیر تک مقابلہ جاری رہا پھر سکوت چھا گیا۔ اچانک کسی جانب سے فائر ہوتا جواب میں تڑاخ تڑاخ کی آوازیں گونجتیں اور خاموشی چھا جاتی۔ اسی آنکھ مچولی میں آدھی رات گزر گئی۔ اب تقریباً نصف گھنٹے سے مکمل

سکوت چھایا ہوا تھا۔ جھینگروں کی جھائیں جھائیں صاف سنائی دے رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ازل سے اب تک سناٹے کا سلسلہ ٹوٹا ہی نہ ہو۔ اچانک کئی بھیانک دھماکے ایک ساتھ ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے پچھلی جانب باتھ روم کے روشندان کے شیشوں پر آگ کی سرخی نظر آئی۔ پھر فوراً ہی مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ گونجنے لگی اس کے ساتھ ہی کچھ چیخیں سنائی دیں۔ مشین گنیں کچھ دیر چل کر بند ہوگئیں اور ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ کچھ دیر گزری ہوگی کہ آرمی کے بوٹوں اور لوگوں کی بول چال کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ لوگ سہمے ہوئے بیٹھے تھے کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔ سب نے گھبرا کر ایک دوسرے کے چہرے دیکھے۔ کچھ لمحے گزرے ہوں گے کہ دروازہ اور زور سے پیٹا گیا۔ اندر کون ہے دروازہ کھولو۔ کریم لالہ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی چار آرمی گارڈ گنیں لیے دندناتے ہوئے اندر گھس آئے اور ان سے سوالات کرنے لگے وہ لوگ کون ہیں کہاں سے آئے ہیں۔ کہاں جانا ہے۔ لالہ نے انھیں اپنے بارے میں بتلایا۔ اپنے ٹکٹ دکھلائے ٹکٹ دیکھنے کے بعد ان کا سامان چیک کیا گیا پھر انھوں نے ویٹنگ روم کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ تلاشی کے بعد لالہ نے ان سے سوال کیا کیا ہم لوگ باہر جا سکتے ہیں۔ ہمیں کچھ کھانے پینے کا سامان خریدنا ہے۔ جواب میں گارڈ نے اجازت دے دی۔ ریلوے پلیٹ فارم پر سناٹا تھا۔ اکا دکا لوگ نظر آرہے تھے۔ پلیٹ فارم کے باہر آکر معلوم ہوا آرمی والے کچھ لوگوں کو گرفتار کر کے لے جا رہے تھے کہ مجاہدین نے حملہ کر دیا جب سے اب تک مقابلہ چل رہا تھا۔ مجاہدین نے گرینڈ پھینک کر آرمی کے نرغے سے نکل جانا چاہا تو آرمی نے گنوں پر رکھ لیا۔ دو فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور دو مارے گئے جن میں ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ ٹیکسی اسٹینڈ سے ذرا آگے ان کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے پاس ایک گارڈ کھڑا پہرہ دے رہا تھا۔

لوگ لاشوں کے پاس سے گزرتے، ایک اچٹتی نظر ڈالتے اور آگے بڑھ جاتے یہ لوگ بھی لاشوں کے پاس سے گزرے تو خالد بری طرح چونکا۔ اس کی نگاہیں لڑکی کے چہرے پہ مرکوز تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے خالد کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے جھک کر لاش کا

چہرہ غور سے دیکھا پھر ایک فلک شگاف چیخ اس کے حلق سے نکلی اور وہ لڑکی کے مُردہ جسم سے لپٹ کر رونے لگا۔

"ہائے میری شبنم یہ تمھیں کیا ہوگیا، آنکھیں کھولو۔ دیکھو میں واپس آگیا ہوں۔ مجھ سے مُنہ مت موڑو شبنم"۔ یہ کہتے کہتے اس نے جذبات میں لڑکی کے چہرے کو دائیں بائیں حرکت دی اور مزید بیقرار ہوکر رونے لگا" ہائے ہائے ان ظالموں نے تمھیں کیوں مار ڈالا تم تو معصوم تھیں ہائے.....!"

نزدیک کھڑا گارڈ بُری طرح چونکا اور حیرت سے خالد کو دیکھنے لگا پھر اس نے ڈپٹ کر خالد کو کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ اور جیب سے فون نکال کر کسی سے بات کی۔ پانچ منٹ کے اندر ہی ملیٹری جیپ وہاں پہنچ گئی۔ ان کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ خالد لڑکی کا شناسا ہے۔ انھوں نے خالد کو جیپ میں بٹھایا اور اپنے ہمراہ لے گئے۔

خالد بیچارہ بلائے ناگہانی میں گرفتار ہوگیا۔ اس سے سوال کیا گیا کہ وہ اس لڑکی کو کیسے جانتا تھا۔ جواب میں اُس نے اپنی محبت کی داستان کے ساتھ اپنے کلکتے کے سفر کے بارے میں بتلا دیا۔

"شبنم کے اور دوسرے ساتھی کون کون ہیں اور وہ کہاں رہتے ہیں" اس سوال کا جواب خالد کے پاس نہیں تھا۔ خالد تو یہ بھی ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ شبنم کا دہشت گردوں سے کچھ واسطہ تھا۔ اب سچ اگلوانے کے لیے خالد پر سختیاں شروع ہوگئیں۔ وہ تو ایک مایوس عاشق تھا۔ اپنی محبوبہ کی لاش دیکھ کر ہی اس کا جگر پارہ پارہ ہوگیا تھا۔ وہ لوگ اس سے جتنا بھی خون تھکواتے اُسے کیا فرق پڑتا، جب اس پر زیادہ سختی ہوئی تو عاجز آکر اُس نے کہا" کچھ ایسی تدبیر کرو کہ میری جان نکل جائے۔ میرے لیے اس سے زیادہ اذیت کی بات اور کچھ نہیں ہے کہ میں نے اپنی شبنم کو خون میں لتھڑے ہوئے لاش کی شکل میں دیکھا ہے۔" آرمی کے افسر نے جھلّا کر اس کے منہ پر تھپڑ مارا" سچ کیوں نہیں بولتا سچ کیا ہے؟"

"سچ یہ ہے کہ میں اب مرجانا چاہتا ہوں۔"

آخر کار اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا اور اس کی فائل انکوائری کے لیے انٹیلی جنس کے پاس بھیج دی گئی۔ جس جگہ اس کو بند کیا گیا وہاں ایک لڑکا اصغر بھی تھا۔ خالد نے اصغر کی جانب کوئی توجہ نہیں کی بس گم صم خاموش بیٹھا رہا۔ رات کو سوتے وقت اصغر خالد سے اچانک یوں مخاطب ہوا جیسے کسی ٹرین کے مسافر ایک دوسرے سے اس کی منزل کا پتہ پوچھتے ہیں، آپ کیسے پکڑے گئے، آپ کا جرم کیا ہے؟

میرا جرم؟ میرا جرم یہ ہے کہ میں اپنی شبنم کی لاش سے لپٹ کر آنسو بہا رہا تھا اور اب یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم بھی دہشت گرد ہو کیوں کہ تمہاری محبوبہ شبنم دہشت گرد تھی۔

"شبنم کون؟ وہ کہاں کی رہنے والی تھی؟" اصغر نے چونک کر سوال کیا۔

"ہم سری نگر کے رہنے والے ہیں۔ وہ لالہ یعقوب کی بیٹی تھی۔"

"کیا کہہ رہے ہو شبنم ماری گئی؟" اصغر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"مگر تم شبنم کو کیا جانو میں نے تو تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"مگر میں تمہیں پہچان گیا ہوں، کیا تم امیراکدل کے رہنے والے نہیں ہو اور وہی خالد نہیں ہو جو بال بردار مزدور بن کر سکھتے گئے تھے؟"

جواب میں خالد نے اثبات میں اپنی گردن ہلائی۔

"شبنم تمہارا ذکر اکثر کیا کرتی تھی اور اس بات سے پریشان تھی جب تم واپس آؤ گے تو وہ تمہیں اپنی شکل کیسے دکھلائے گی۔"

"کیوں؟ ایسا کیا ہوا تھا کہ وہ مجھے اپنا چہرہ دکھلانے سے گریز کرنا چاہتی تھی؟"

"ریپ ہوئے تھے اس کے ساتھ اور وہ ایک معصوم نرم و نازک دوشیزہ سے خون خوار شیرنی بن گئی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ تم کو کبھی منہ نہیں دکھلائے گی۔ اب اس کی زندگی کا مقصد تم نہیں تھے بلکہ انتقام اور صرف انتقام تھا۔ وہ ایک وحشی مجاہدہ بن گئی تھی۔ بھائی خالد اس عرصہ میں اس نے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔" یہ کہتے کہتے اصغر کا گلا رندھ گیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ آئیں۔

کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر خالد نے سوال کیا "آخر شبنم مجاہدہ بنی کیسے؟"

"آرمی والوں نے سرینگر کے ایک علاقے میں ریڈ کیا اور مجاہدین کی پناہ گاہ سمجھ کر کچھ مکانوں کو آگ لگادی تاکہ مجاہدین نکل کر بھاگیں تو وہ ان کو گولیوں سے بھون ڈالیں۔ اس آگ کی زد میں شبنم کا مکان بھی آگیا۔ جب آگ زیادہ بڑھی تو شبنم اور اس کے گھر والے عقبی دروازے سے نکلے کیوں کہ سامنے کی جانب سے گولیاں چل رہی تھیں رات کا اندھیرا، آگ کی تپش اور دھوئیں سے دم گھٹ رہا تھا۔ شبنم کا ساتھ اس کے والدین سے چھوٹ گیا۔ خوفزدہ ہرنی کی طرح وہ گھبراکر بھاگ رہی تھی کہ ملیٹری نے پکڑ لیا اور دہشت گرد بناکر بند کر دیا پھر اس کے ساتھیوں کے نام اگلوانے کی کوشش کی جانے لگی اور انھیں کوششوں میں اس کے ساتھ ریپ ہوئے۔ وہ معصوم بھلا کس کا نام بتاتی۔ بس ان درندوں کو بہانہ مل گیا اور من مانی پر اتر آئے تم تو جانتے ہی ہو وہ کتنی خوبصورت تھی۔ اس کا حسن اس کے لیے مصیبت بن گیا۔ ہر کوئی اس کے حسن کی دولت لوٹنے کو بیقرار تھا۔ وہ اسے نوچتے کھسوٹتے بھنبھوڑتے، وہ چیختی چلاتی اور نڈھال ہو کر گردن ڈال دیتی۔ جسمانی تکالیف اور ذہنی اذیت کے الاؤ میں جل کر اس کا روپ خاکستر ہو گیا۔ اس کے چہرے کے گلاب مرجھا کر خشک ہو گئے اور وہ مردہ ہو گئی۔ جب انھوں نے اس کے ہونٹوں کا سارا امرت چوس لیا تو اُسے چھوڑ دیا۔

اب اُن عفریتوں کا زہر اس کے جسم میں پیوست ہو کر جڑ پکڑ رہا تھا، وہ اپنے لاشے کو کاندھے پر اٹھائے گھر آئی تو وہاں اس کے مکان کے بجائے راکھ کا ڈھیر تھا۔ ماں باپ پتہ نہیں کہاں گئے زندہ بھی رہے یا نہیں؟

وہ اپنے مکان کے تباہ شدہ ملبے کے پاس بیٹھی آنسو بہا رہی تھی کہ ہماری جماعت نے دیکھ لیا اور اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ بہن بناکر ساتھ رکھا۔ اور پھر اس پھول کی ڈالی کو سان پر چڑھا کر آبی ہوئی تلوار بنا دیا۔ اس کے چہرے کی شگفتگی اور جسم کی نازکی ختم ہو گئی۔ اب وہ ایک تیز تند طوفان تھی جس کے جلو میں بارش کا ٹھنڈا پانی نہیں بلکہ دہکتے ہوئے جوالوں کی آگ تھی۔ نفرت اس کی رگوں میں دوڑنے والے لہو کا مرکب بن چکی تھی۔ بھائی خالد شبنم نے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ جہاں جان جانے کا یقینی

احتمال ہوتا مرد جھجکتے وہاں وہ خود کو پیش کر دیتی اور کامیاب لوٹتی۔ وہ شیرنی کی طرح جھپٹتی اور دشمن کا قلع قمع کر دیتی۔

اصغر کی باتیں سن کر خالد کے پژمردہ چہرے پہ جنون کے سائے لہرانے لگے۔ اس کی مایوس آنکھوں کی سفیدی سرخی میں یوں تبدیل ہوگئی جیسے کسی آگ کی بھٹی میں دھونکنی سے ہوا دے دی گئی ہو۔ سانس کی رفتار تیز ہوگئی اور وہ اپنی خون بھری آنکھوں سے اصغر کا چہرہ تکنے لگا۔ کچھ دیر تک اصغر بھی خالد کے چہرے کا متغیر ہوتا رنگ دیکھتا رہا پھر وہ کسی سانپ کی طرح پھنکارہ "خالد... تم بھی مجاہد بن جاؤ اور اپنا انتقام لو۔"

خالد نے کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھا لیکن منہ سے کچھ بولا نہیں۔

دوسرے دن بھی خالد گم صم رہا۔ رات کو اچانک اس نے اصغر سے دریافت کیا "بھائی اصغر! میں مجاہد کیسے بن سکوں گا؟"

اصغر نے جواب میں مسکرا کر اسے دیکھا "یہ تو میں نہیں جانتا کہ مجاہد بننے کے لیے تمھیں کس سے ملنا ہوگا۔ ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں اب تمھاری قسمت میں مجاہد بننا ہی لکھا ہے۔ حریت پسندوں کی جماعت تمھیں خود تلاش کر لے گی۔"

تقریباً تین ماہ خالد کی تفتیش چلتی رہی۔ آخر کار اسے چھوڑ دیا گیا۔ رہائی کے وقت اس کے والد موجود تھے۔ انھیں کی کوششوں سے وہ رہا ہوا تھا۔ وہ ان کے ساتھ گھر آگیا۔ اس عرصہ یہاں شہر میں کافی تبدیلی ہوگئی تھی۔ ہر چوراہے اور موڑ پر آرمی کے دستے تعینات تھے۔ جگہ جگہ جلتے ہوئے مکانوں اور دکانوں کے ملبے نظر آرہے تھے۔ بازار کی چہل پہل کم ہوگئی تھی۔ لوگ ڈرے ڈرے اور سہمے ہوئے سے نظر آرہے تھے۔ یہ سب دیکھ کر خالد کے دل کی وحشت اور بڑھ گئی۔ وہ شبنم کے بارے میں سوچتا تو اس کا دم گھٹنے لگتا۔ اس کے اندر کا سلگتا ہوا لاوا دھڑا دھڑ جلنے لگتا خون کی روانی تیز ہو کر سانسوں کے ساتھ آگ کی گرمی باہر نکلنے لگتی۔ معصوم سفید آنکھوں میں کچے گوشت کی سرخی ابھر کر آنکھوں کو ڈراؤنا کر دیتیں۔ وہ کسی خونخوار درندے کی طرح دھیرے دھیرے ہانپتا رہتا پھر ایک لمبی سانس بھر کر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جاتا۔ آرزوؤں

کا بلوری تاج محل اس کے اندر ٹوٹ کر بکھر جاتا۔ اور اس کی کرچیوں سے زخمی ہو کر وہ کراہنے لگتا۔

اس نے کلکتے جا کر جو کچھ کمائی کی تھی وہ سب روپیہ اس کی رہائی کے سلسلے میں خرچ ہو گیا تھا۔ گھر میں کافی تنگی ترشی تھی۔ جاڑے کے سیزن میں بھی ابھی بہت دن تھے کہ دوبارہ کریم لال کے ساتھ چلا جاتا۔ وہ خیال کرتا آزاد کشمیر پاکستان ہجرت کر جائے لیکن اس میں خطرہ تھا۔ بورڈر پار کرنا آسان نہیں تھا۔ وہاں پر آج کل زبردست ملیٹری لگی ہوئی تھی۔ وہ انھیں سوچوں میں غلطاں بازار میں گھوم رہا تھا کہ ایک آدمی اس سے ٹکرایا اور اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھماتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ جب تک خالد پلٹ کر دیکھے وہ شخص نزدیک کی گلی میں داخل ہو کر غائب ہو گیا۔

لفافے پر خالد کا نام لکھا تھا۔ اس نے حیران نظروں سے لفافے کو دیکھا پھر کسی خیال کے آتے ہی اس نے فوراً وہ لفافہ قمیص کی جیب میں چھپا لیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوف ملی گھبراہٹ نے اس پر حملہ کیا تو اس کی سانس پھولنے لگی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے بھرے بازار میں وہ برہنہ ہو گیا ہو۔ اس نے کنکھیوں سے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا اور تیزی سے اپنے قدم گھر کی جانب بڑھا دیے۔ گھر پہنچ کر اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور لفافہ چاک کر کے پرچہ باہر نکالا۔

لکھا تھا "خالد بھائی السلام علیکم! آپ پر جو ظلم و ستم ہوئے ہیں اس کے بارے میں ہمیں سب علم ہے۔ معصوموں کو ظلم سے نجات دلانے اور اپنے وطن کو آزادی دلانے کے لیے ہم نے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں۔ یہ جدوجہد آزادی ہر کشمیری پر فرض ہے۔ کوئی نابینا ہی اس فرض سے تغافل کر سکتا ہے یا پھر وہ لوگ جن کے دل حیوانات کی طرح قومی حس سے بالکل خالی ہیں یا جن کے احساسات پر فالج گر گیا ہے۔ یہ زندگی خدا کی عطا کردہ ایک نعمت ہے اس نعمت کو ذلت و خواری میں برباد کرنے سے بہتر ہے کہ اُمیدِ صبحِ بہاراں کی خاطر ہم آزادی کی جنگ لڑیں اور اپنے خدا کے حضور سرخرو ہو کر جائیں۔ ہمارا مشورہ ہے کہ آپ بھی ہماری جماعت میں شامل ہو جائیے۔ آپ خوب سوچ سمجھ لیجیے

اگر آپ کا ارادہ تحریک میں شامل ہونے کا ہو تو پرسوں دوپہر ایک بجے اپنی داہنی کلائی میں ایک سُرخ رومال باندھ کر بازار میں آ جائیے گا یہ اس بات کی نشانی ہوگی کہ آپ نے وطن کی آزادی کی خاطر سرفروشی قبول کر لی ہے۔ آپ کی رضا ملنے کے بعد ہم آپ سے رابطہ کر لیں گے۔ آپ جو بھی فیصلہ کریں یہ آپ کی مرضی ہوگی لیکن خدارا اس خط کو فوراً جلا دیجیے گا۔ سُرخ رومال آپ کو بازار میں آسانی سے مل جائیں گے

فقط آپ کا بھائی ایک سرفروش''

خالد تذبذب میں پڑ گیا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ پیار کی راہوں پہ چلتے چلتے وہ شاخ سے کسی گہری کھائی میں جا گرے گا۔ وہ سوچنے لگا شبنم ماری گئی اب میری زندگی میں کیا رکھا ہے سُلگ سُلگ کر جینے سے تو بہتر ہے آزادی کی تحریک میں شامل ہو کر وطن پہ فدا ہو جاؤں، مگر ابا بوڑھے ہو گئے ہیں میرے بعد ان کا کیا ہوگا۔ کیا اسی دن کے لیے انھوں نے میری پرورش کی تھی۔ پھر اس کے اندر سے آواز ابھری خالد اتم بزدل ہو وطن کا ہر جوان اگر تمھاری طرح سوچنے لگے تو آزادی کا سورج کبھی بھی طلوع نہیں ہو سکے گا کیا کرنا چاہیے وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

دوسرے دن وہ لال چوک گیا تو اس نے دیکھا دکانوں میں مختلف رنگوں کے رومال لٹکے ہوتے ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ سُرخ رنگ کے رومال پر نظر پڑتے ہی اس کے ذہن کو جھٹکا لگا جیسے برقی تاروں کو اس نے چھو لیا ہو۔ اس کے پورے جسم میں سنسناہٹ دوڑنے لگی۔ یہ عام رومال جن کو اس نے بارہا دکانوں میں لٹکتے دیکھا تھا کبھی اس کی توجہ کا مرکز نہیں بنے۔ لیکن آج ان پر نظر پڑتے ہی اس کے دل کی حالت عجیب ہو گئی تھی۔ وہ مبہوت ہو کر انھیں گھورنے لگا جیسے سرخ رنگ کی مقناطیسیت نے اسے اپنی جانب کھینچا ہو۔ اس کے قدم خود بخود رومالوں کی جانب اٹھنے لگے، تب ہی اس کے اندر سے آواز ابھری خالد تیرے بعد ابا اماں کا کیا ہوگا۔ جیسے کوئی چلتی ٹرین کی زنجیر کھینچ لے۔ خالد کے قدم زمین نے پکڑ لیے ابھی کشمکش کے عالم میں وہ خالی خالی نظروں سے رومالوں کو تک ہی رہا تھا کہ خوفناک بموں کے دھماکے اور مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ اس کے دماغ میں گونجنے لگی۔ پھر ایک سرخ رومال پر شبنم کا خون آلود چہرہ ابھرا۔ شبنم نے اپنی غلافی آنکھیں کھول کر حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ خالد

بھنور

خیرو نے گھنگھرو بندھے پاؤں سے چھما چھم چلتے ہوئے اپنا بھونپو اٹھایا اور منہ اوپر کر کے ایک کڑک دار ہانک لگائی "چنا جور گرم....."

اور اس کے ساتھ ہی ایک ہاتھ سے بھونپو پکڑے دوسرے ہاتھ سے چٹکی بجاتا اور تال دیتا ہوا وہ ٹھمک ٹھمک کر ناچنے اور گانے لگا۔

"میرا چنا بنا ہے اعلیٰ، اس میں ڈالا گرم مسالہ، لائے جوبن یہ نرالا، کھائے اس کو دل والا، چنا جور گرم بابو، او بابو چنا جور گرم، میں لایا مجے دار....."

مجمع میں کھڑے لڑکوں نے اس کے ساتھ تال دینا شروع کر دی، مگر مال کی مانگ زیادہ نہیں ہوئی۔ خیرو اسی طرح ناچتا گاتا رہا۔ بچے ہنستے رہے۔ چنے چند ایک نے ہی خریدے۔ خریداری بڑھتی بھی تو کیسے؟ آج اسے موج ہی نہیں آرہی تھی اور نہ اس کا کام میں دل لگ رہا تھا۔ حالاں کہ یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا کہ وہ اس ہیئت کذائی میں آوازیں لگاتا، ناچتا، گاتا سڑکوں پر آوارہ لڑکوں کا غول لیے گھومتا پھرتا۔ مونچھیں اس کی اتنی لمبی تھیں کہ کانوں کی لویں چھو رہی تھیں۔ ناک برابر کی پھننگی والا گول چشمہ جما ہوا دونوں پپوٹے کھریا مٹی سے لتھڑے ہوئے۔

وہ ہمیشہ بچوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتا جھوم جھوم کر گاتا، طرح طرح کی آوازیں نکالتا اور مسخرے پن سے ناچتا تو لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے۔ لوگ باگ اس کی اٹکھیلیاں دیکھنے کو ٹھہر جاتے اور پھر جب خریداری شروع ہوتی تو دیکھتے ہی دیکھتے

اس کی جھولی خالی ہونا شروع ہو جاتی۔

"مگر آج اس کے حلق سے ڈھنگ کی آوازیں نکل ہی نہیں رہی تھیں۔ کومیڈی ماسٹر خود زیربجٹی کا شکار تھا تو موج کہاں سے آتی اور مال کیسے فروخت ہوتا۔

آخر کار وہ سر جھکا کر اپنی سوچوں میں ڈوبا ہوا آگے روانہ ہو گیا۔

کاش اس کے بیٹے زندہ رہ جاتے تو آج یہ پریشانی نہ ہوتی۔ بیٹے تو اللہ میاں نے دو دو دیے مگر واپس لے لیے۔

اس کی جگہ تین لڑکیوں کا بوجھ سر پر رکھ دیا اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ جیسی اللہ کی مرضی۔

ایک ہفتے سے بیوی سے اَن بن چلی رہی تھی۔ اب کل ہی میل ہوا تھا۔ جھگڑا بھی کس بات کا تھا اُسی نہ ہوتی کا کمانے والا وہ اکیلا اور پانچ جانوں کا خرچ اوپر سے مہنگائی روز روز کی تُو تُو میں میں اور ٹھکا فضیحتی تھی۔ کبھی کبھی نوبت فاقے تک بھی پہنچ جاتی تو اس روز جمیلن اُسے جلی کٹی سُناتی۔ بات بڑھ جاتی۔ جوتی پیزار ہوتی اور بول چال بند ہو جاتی۔ دونوں ایک ہی چھت کے نیچے رہ کر ریلوے ویٹنگ روم کے مسافروں کی طرح ایک دوسرے کو اجنبی اجنبی نگاہوں سے دیکھا کرتے۔ پھر یہ اجنبیت شناسائی میں تبدیل ہو جاتی تو خفت اور ندامت کے جذبات کے ساتھ خیرو کو اپنی زیادتی کا احساس ہوتا اور غیر ارادی طور پر اس کی نظریں بازار کی دکانوں کا طواف کرنے لگتیں۔ جھلمل کرتے ریشمی موباف رنگ برنگی چوڑیوں طرح طرح کے پاؤڈر اور قسم قسم کی کریموں کی شیشیوں کو وہ دیر تک تکتا رہتا خود بخود اس کا ہاتھ جیب کی طرف رینگ جاتا اس کی انگلیاں جیب میں پڑے سکوں سے کھیلتی رہتیں اور جب دکاندار اس کی جانب متوجہ ہوتا "کیا چاہیے؟" کی آواز پر اس کی بے خودی ختم ہو جاتی۔ اپنی کم مائیگی کے احساس کے ساتھ اس کے چہرے پہ ویرانی کے بادل چھا جاتے۔ وہ کشمکش میں مبتلا ہو جاتا۔ پھر ہمت کر کے دو چار آنے کا مہندی کا پیکٹ کبھی موباف، تو کبھی پلاسٹک کی چوڑیاں خرید ہی لیتا۔

جمیلن کے تیکھے انداز میں نرمی و سہل کا کام کرتی اور پلیٹ فارم پر رُکی ہوئی

زندگی کی گاڑی دوبارہ رینگنے لگتی۔

لیکن اس بار۔۔۔۔

اس بار بہت نہیں کیا ہونے والا ہے۔ خیرو منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

اچانک اس نے اپنے بازو پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ پلٹ کر دیکھا تو اس کا دوست شبراتی کھڑا دانت نکال رہا تھا۔

"کہاں جارہے ہو دوست کیا آج مال جلدی بکری ہو گیا؟"

"مال بکری ہو گیا۔۔۔" مال کی فروختگی کا خیال آتے ہی خیرو کی آنکھوں کے پیالے لبالب بھر گئے۔

"ارے یار کیا ہو گیا؟ تو رو کیوں رہا ہے؟"

"میں مرجانا چاہتا ہوں!"

"آخر ہوا کیا ہے؟ منہ سے تو بول!"

وہ سلمٰی۔۔۔ سلمٰی پیٹ سے ہے اور دن قریب آگئے ہیں۔"

"تو پھر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ یہ تو خوشی کا موقع ہے۔"

"داماد نے دھمکی دی ہے اگر اس کی پرانی ڈیمانڈ پوری نہیں کی گئی تو وہ سلمٰی کو طلاق دے دے گا۔" یہ کہتے کہتے خیرو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"اور ڈیمانڈ کیا ہے؟ وہی چھت کا پنکھا، سائیکل اور گھڑی؟"

خیرو نے اثبات میں گردن ہلائی۔

تُو تو گدھا ہے میں کب سے کہہ رہا ہوں اس دھندے کو چھوڑ دے یہ ان لوگوں کا کام ہے جن کے سر میں گودا نہیں ہوتا۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟"

"میری طرح استادی کر۔"

"یعنی بھیک مانگوں؟"

"ابے تو اسے بھیک کہتا ہے یہ تو روزگار ہے روزگار اور دیکھا جائے تو یہ

ہمارا امیروں پر احسان ہے۔"

"کیا اُلٹا سیدھا بک رہا ہے میری سمجھ میں تیری باتیں نہیں آتیں۔"

"ارے اتنی موٹی سی بات بھی تو نہیں سمجھتا اگر ہم جیسے لوگ دنیا میں نہ ہوں تو پھر یہ پیسے والے جنت میں کیسے جائیں"، وہ ہمیں بھیک دے کر ہی تو جنت میں اپنے لیے محل تعمیر کراتے ہیں۔

"نہ نہ... یہ مجھ سے کبھی نہ ہوگا۔"

"تو پھر بنا رہ مسخرہ نوچتا رہ اپنی جورو کا جونڈہ اور کرتا رہ جوتی بیزار"، شبراتی غصہ میں کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

خیرو محبت بنا اس کو جاتے دیکھتا رہا وہ جانتا تھا شبراتی جو کچھ بھی کرتا ہے وہ بڑا گھناؤنا فعل ہے۔ دن بھر اپنے بیوی بچوں کی بیماری اور موت کے جھوٹے قصے لوگوں کو سُنا سُنا کر وہ ان سے روپے اینٹھتا ہے اس دھندے کے لیے وہ شہر شہر کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں خوش حالی ہے لیکن خیرو خود دار تھا۔ بھیک مانگنے اور ہاتھ پھیلانے کو وہ حرام سمجھتا تھا۔ وہ محنت مشقت کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پال رہا تھا۔

اس کا ذہن ماضی کے دھندلکوں میں بھٹکنے لگا۔ اپنی ننھی مُنّی سلمیٰ سے وہ کتنا پیار کرتا تھا۔ کیسے کیسے جتن کر کے اس نے اپنی بیٹی کو پالا تھا۔ وہ جب من بھر کا تھکا ماندہ گھر واپس آتا تو اس کی گڑیا اپنے ننھے منّے ہاتھ بڑھا کر اس کے پاس آنے کو ہمکتی اور وہ اس کو گود میں لے کر جب پیار کرتا تو اپنی دن بھر کی تھکن بھول جایا کرتا تھا۔ پھر جب وہ بڑی ہوئی تو اس کا تتلا تتلا کر بولنا اس کے دل کو موہ لیتا تھا۔ روز صبح جب وہ اس سے دیر تک باتیں کرتا رہتا تو جمیلن چیختی "دن چڑھ رہا ہے کام پر نہیں جاؤ گے کیا؟ بچی سے دن بھر یوں ہی باتیں کرتے رہنا"، وہ اپنی بیٹی کو چٹاخ چٹاخ پیار کرتا اور کام پر نکل جاتا۔

آہستہ آہستہ سلمیٰ بڑی ہوتی گئی اور پھر وہ کب جوان ہوئی خیرو کو خبر ہی نہیں ہوئی اسے تو جب ہوش آیا جب جمیلن نے اس سے کہا "ارے سلمیٰ کی بھی کچھ فکر کر رہے ہو

یا یوں ہی زندگی بھر چکرم کی طرح گھومتے پھرو گے۔ صبح گئے شام کو آگئے۔ بیٹی جوان ہو چکی ہے بار بار چھت پر جا چڑھتی ہے میں کہاں تک پہرہ دوں کچھ اُنیس بیس ہو گیا تو کیا ہوگا۔"

گذشتہ سال کے تمام واقعات اُس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے جب سلمیٰ کے بیاہ کی بات چیت اس کے دوست شبراتی نے چلائی تھی اور داماد نے پنکھا، سائیکل اور گھڑی بھی مانگی تو وہ گھبرا گیا تھا کہ اتنا بندوبست وہ کیسے کر سکے گا کیوں کہ اس کے ساتھ ہی تھوڑا بہت جہیز بھی درکار تھا اور پھر باراتیوں کو کھانا بھی کھلانا ہوگا۔ یہ شبراتی ہی تھا جس نے مشکلات کے اُلجھاوے کی ڈور اپنے تیز دانتوں سے کتر کتر کر الگ کر دی تھی اور پھر سرے آپس میں یوں جوڑے تھے کہ وہ بھی دیکھتا رہ گیا تھا۔

خدا کا کرنا محلّے کے تاجر رفیق صاحب کی بیٹی جو کہ عرصے سے کینسر میں مبتلا تھی اس کا انتقال ہو گیا تو سلمیٰ کی قسمت کا ستارہ چمک گیا۔ وہاں سے کچھ نئے پُرانے کپڑے لتّے مل گئے ادھر جمیلن نے اپنے کان کی بالیاں فروخت کر دیں۔ داماد کی فرمائش کچھ روز بعد کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ یوں کسی نہ کسی طرح لشتم پشتم سلمیٰ کی شادی ہوئی تھی۔

ابھی ڈیڑھ سال ہی گزرا تھا کہ پھر ایک بھیانک مسئلہ سامنے آ کھڑا ہوا۔ سلمیٰ اُمید سے تھی اور بچّے کی پیدائش کا وقت قریب تھا۔ اس کے داماد اختر نے وارننگ دے دی کہ بچّے کی پیدائش پر زچہ و بچّے کا جوڑا چاہیے۔ نیز پنکھے، سائیکل اور گھڑی کا پُرانا وعدہ پورا نہیں کیا گیا تو وہ زچگی کا خرچ برداشت نہیں کرے گا۔ سلمیٰ کو طلاق دے کر واپس میکے بھیج دے گا۔

خیرو کے دل میں ہیجان بپا تھا۔ دل تھا کہ روئے دے رہا تھا۔ "اے میرے مشکل کشا میری مدد کر۔"

وہ سوچوں میں گم گردن جھکائے اپنے گھر کی جانب چلا جا رہا تھا۔

اُسے مولوی صاحب کا وعظ یاد آیا "چین و سکون دنیا میں نہیں ہے۔ سچّی خوشی صرف خدا کی یاد میں ہی مل سکتی ہے۔ اگر تم سکون چاہتے ہو تو اپنے دل کو دنیا سے ہٹا کر

خدا کی جانب لگا لو تو یقیناً تمھیں چین ملے گا۔"

لیکن اس بات کو اس کا دل ہی خوب سمجھتا تھا کہ ایسی پریشانی اور گھٹن میں خدا سے لو لگا نا کبھی آسان نہیں۔

اپنی غریبی کا شکوہ اُس نے کبھی اپنے اللہ سے نہیں کیا تھا لیکن آج حد سے بڑھتی ہوئی پریشانی نے اُس کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے کیا اپنی جان کو ختم کر دے؟

مسئلہ جب بھی ختم نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس کی موت سے اس کے گھر والوں کی پریشانیاں اور بڑھ جائیں گی۔ اس کو رہ رہ کر گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ کہیں اختر سلمیٰ کو اس کے گھر نہ پہنچا دے۔

اُن ہی خیالات میں گم خیرو سہما سہما سا اپنے گھر میں داخل ہوا جیسے سائرن بج رہے ہوں اور بمباری ہونے والی ہو وہ پناہ کی تلاش میں اندر کوٹھری میں گھستا چلا گیا کہ جمیلن سے سامنا ہو گیا تو وہ کیا جواب دے گا۔

چھوٹی بیٹی نے بتلایا سلمیٰ آپا کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ اماں اور نجمہ آپا وہاں گئی ہیں۔

یہ سُنتے ہی خیرو کا سر کسی طیارے کے پنکھے کی طرح گھومنے لگا۔ اس نے ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھالا۔ وضو کر کے مصلیٰ بچھایا اور سجدہ ریز ہو گیا۔

"اے میرے مولا رحم فرما، تیری کیا مرضی ہے، میں کیا کروں۔ کیا بھیک مانگنا شروع کر دوں یا چوری ڈکیتی کیا کروں؟ کہاں سے لاؤں پیسہ؟ مجھے غریب رکھنا تھا تو بے اولاد ہی رکھتا۔ اتنی بے بسی تو نے میری تقدیر میں کیوں لکھ دی، اے بار الٰہ بیشک تو تمام معاملات پر حاوی ہے۔ یہ میرا ایمان ہے کہ تیری مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا۔ دُکھ اور سُکھ سب تیری ہی جانب سے ہوتے ہیں تو دُکھ دے کر اپنے بندوں کو آزماتا ہے۔ پر میرے معبود میری تو تمام عمر امتحان دیتے دیتے گزر گئی اور میں نے اُف تک نہیں کی۔ اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ میں تیرے آگے

دامن پھیلا رہا ہوں میرے مولا میرے اوپر رحم فرما، ورنہ تو مجھے موت دے دے۔"

دھیرے دھیرے جائے نماز آنسوؤں سے تر ہوتی چلی گئی۔ دل پر چھائی ہوئی گھٹا برسی اور خوب ٹوٹ کر برسی۔ اب دماغ میں چلتی ہوئی آندھیوں کے جھکڑ اور ان کی سائیں سائیں بھی آہستہ آہستہ دم توڑ رہی تھی۔ وہ بے سدھ سا جائے نماز پر پڑا ہوا تھا کہ آہ و فغاں کے زبردست شور سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ جیسے پلیٹ فارم کی بینچ پر سکون سے لیٹا ہوا مسافر ٹرین کی جانب دوڑے۔ وہ جائے نماز سمیٹتا تیزی سے آگے بڑھا سلمیٰ، ہائے میری سلمیٰ کی آوازوں کا شور اس کی سماعت سے ٹکرایا۔

جمیلن اپنے دونوں ہاتھوں سے چھاتی پیٹتی ہوئی بین کر رہی تھی "ہائے میری سلمیٰ۔ تجھے یہ کیا ہو گیا، کیا یہ تیرے جانے کے دن تھے۔ ارے تیرے بدلے میں مر جاتی۔ تو اس جہنم سے چھٹکارہ مل جاتا۔ ہائے مولیٰ کیا کروں کس سے فریاد کروں۔"

خیرو نے گھبرا کر بیوی سے دریافت کیا "اری کیا ہوا... کیوں چیخ رہی ہے!"

اس سے قبل کہ جمیلن جواب دے چھوٹی بیٹی نسیمہ بولی "سلمیٰ آپا کا انتقال ہو گیا ان کا بچہ پیٹ میں مر گیا تھا۔ ایک بجلی چمکی اور دھماکے کے ساتھ خیرو کے حواس جلتے رہے جیسے ایک تیز رفتار ٹرین دندناتی ہوئی اس کے وجود پر سے گذرتی چلی گئی ہو۔ اور وہ زخمی لہولہان حواس کے بچے کھچے ٹکڑے سمیٹتا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نسیمہ کو تکنے لگا۔ اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کو فضا میں اچھال دیا ہو اور وہ ہوا میں تیرتا، ہاتھ پاؤں مارتا ہر بوجھ سے عاری، ہلکا پھلکا کسی کاغذ کی حقیر ترین کی طرح زمین کی جانب واپس آ رہا ہو۔ اور جب اس کے پیر زمین سے ٹکرائے تو اس کے حلق سے ایک عجیب سا قہقہہ نکلا اور وہ دیوانہ وار ہنستا ہوا صحن کی جانب بھاگا تو سامنے کھڑی منجھلی لڑکی پہ نظر پڑی، جس کے ہاتھوں میں دوپٹہ تھا اور دوپٹے سے اپنے منہ کو ڈھانپے بلک بلک کر رو رہی تھی۔

بیٹی کے دوپٹے سے عاری سینے پر نظر پڑتے ہی خیرو کے ذہن میں ایک چھناکا ہوا جیسے تپتے ہوئے لوہے کو پانی بھری بالٹی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس کے قہقہے یک لخت تھم گئے، اور وہ سکتے کے عالم میں مبہوت بیٹی کو تکتا رہ گیا۔

" رحیمہ بی بی کی نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ انتڑیوں کی جلن نے حمیت کو فنا کر کے سارا غصّہ کافور کر دیا تھا۔ دو روز تو کسی نہ کسی طرح پاس پڑوس سے قرض اُدھار کر کے پیٹ کی دوزخ کا ایندھن مہیا کر لیا تھا لیکن آج مکمل فاقہ تھا۔ انھیں بڑی بے چینی سے دتو کا انتظار تھا۔ دن ڈھلتے دروازے پہ دستک ہوئی۔ بے کلی کو کچھ آس نظر آئی۔ وہ بیقرار ہو کر دروازے کی جانب لپکیں۔ کنڈی گرا کر دروازہ کھولا تو سامنے رحمت کا فرشتہ کھڑا نظر آیا۔۔۔ شکرانے کے طور پر ان کے منہ سے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس نکل گئی... بے اختیار اُن کے منہ سے نکلا " بیٹا خیر تو ہے تین دن سے کہاں غائب ہو؟ آؤ اندر تو آؤ۔"

۔۔۔ اسی کتاب سے

تاریک جھروکے

آج صبح سے ہی میرے محلّے میں لوگوں کی آمد و رفت زیادہ تھی، حاجی ثناء اللہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ حاجی صاحب بہت بڑے آدمی تھے۔ بہت بڑے بزنس مین۔ ملک میں ان کی کئی فیکٹریاں چل رہی تھیں۔ کئی شوروم تھے اور وہ کئی بلڈنگوں کے مالک تھے۔ ان کے جنازے میں شرکت کے لیے صبح سے لوگ جوق در جوق آکر جمع ہو رہے تھے۔

میں گھر میں بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا کہ میرے بیٹے نے آکر خبر دی جنازہ تیار ہوگیا ہے، اب میت کو قبرستان لے جانے والے ہیں۔ میں سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے اخبار میں ڈوبا رہا تو میری بیوی نے چونک کر مجھے دیکھا اور ایک کراری آواز نکالی "کیا آپ جنازے میں شرکت نہیں کریں گے جو مزے سے اخبار پڑھ رہے ہیں۔"

"مجھے نہ جانے کیوں دولت مند آدمیوں سے اُلجھن ہوتی ہے اور میں ہمیشہ اُن کی قربت سے کتراتا ہوں معاملہ خوشی کا ہو یا غم کا مجھے ان کے ماحول سے گھٹن ہوتی ہے۔" میں نے اپنی بیوی کی جانب نگاہ اُٹھا کر دیکھا پھر نظریں جھکا کر دوبارہ اخبار پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔

کچھ دیر تک تو میری بیوی نے صبر کیا پھر ذرا تُند لہجے میں گویا ہوئی "میں کیا کہہ رہی ہوں کب جائیے گا جب جنازہ چلا جائے گا تب.....؟ اتنے بڑے آدمی کا انتقال ہوا ہے دور دور سے لوگ شرکت کے لیے آرہے ہیں اور آپ گھر میں بیٹھے مزے سے اخبار پڑھ رہے ہیں۔"

میں نے مذاق کرتے ہوئے جواب دیا "کتنے بڑے آدمی تھے مجھ سے چھوٹے تھے وہ قد میں بھی اور عمر میں بھی۔"

میری بیوی اس قسم کی باتوں سے ہمیشہ نالاں رہی ہے چیخ کر بولی "دولتمند کو بڑا آدمی کہا جاتا ہے۔ آدمی بڑا چھوٹا قد اور عمر سے نہیں کہلاتا سمجھے.....!" پھر بُرا سا منہ بنا کر بولی "آپ کی تو منطق ہی نرالی ہے۔ خدا جانے آپ کو کب سمجھ آئے گی۔"

میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اخبار ایک جانب رکھ دیا اور پھر ایک چٹکی لی "کیا عقل اور سلیم سے بھی آدمی چھوٹا بڑا نہیں کہلاتا؟"

"جب آدمی کے پاس پیسہ آتا ہے تو وہ ہر شئے پر حاوی ہو جاتا ہے۔ عقل کیا اور علم کیا۔ جائیے جلدی جائیے محلّے کا معاملہ ہے۔"

میں نے سوچا بیگم صاحبہ مجھے چین سے اخبار تو پڑھنے دیں گی نہیں اس سے بہتر ہے جنازے میں ہی شرکت کرلوں۔"

میں جب گھر سے نکلا جنازہ جا رہا تھا۔ میں بھی لمبے لمبے قدم بڑھاتا کلمۂ شہادت پڑھتا ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

بے شمار آدمی تھے۔ خلقت کا ایک اژدہام تھا۔ جنازہ جدھر سے نکلتا اُس جانب کا ٹریفک جام ہو جاتا۔ دوپہر کا وقت گرمی بہت سخت تھی۔ لوگ دھوپ کی تپش سے لاپرواہ جنازے کو کاندھا دینے کی خاطر ایک دوسرے پہ چڑھے جارہے تھے جیسے بس اسٹینڈ پر صبح صبح دفتر جانے کے لیے ہم جیسے لوگ سامنے سے بس آتی دیکھ کر ایک دوسرے پہ چڑھنے کی مشق کیا کرتے ہیں۔ ابھی ایک شخص گہوارے کا ہتھ اپنے کاندھے پر رکھ سیدھا ہوتا اور چاہتا کہ کلمہ پڑھنا شروع کرے کہ دوسرا آدمی جھپٹ کر اسے ہٹا دیتا اور جنازہ اپنے کاندھے پر رکھ لیتا وہ بھی دو قدم نہیں چل پاتا کہ تیسرا شخص پھر حاضر ہو جاتا غرض کہ اسی جوش و خروش سے تمام راستہ کٹ گیا۔

قبرستان پہنچ کر ایک درخت کے سائے میں جنازہ رکھ دیا گیا اور لوگ ادھر اُدھر بکھر کر مختلف ٹولیوں میں درختوں کے سائے تلے کھڑے ہو کر آپس میں گفتگو کرنے

لگے۔ میں بھی وہاں کھڑا ہوا اُن کی باتیں سُننے لگا۔

ایک صاحب جو بہت ہی باتونی تھے اور مسلسل بولے جارہے تھے نہایت رازدارانہ لہجے میں بولے "سُنا ہے ثناءُاللہ صاحب کے بیٹوں نے چار لاکھ ٹکے دے کر قبر کی جگہ خریدلی ہے"۔

دوسرے صاحب نے فوراً ہی تردید کی چار لاکھ نہیں پورے بیس۲۰ لاکھ ٹکے دیے گئے ہیں پانچ قبروں کی جگہ ریزرو کی گئی ہے۔

ایک آواز اُبھری بھلا پانچ قبروں کی جگہ کیوں؟

"ارے بھئی ایک قبر حاجی صاحب کے لیے اور بقیہ اُن کے خاندان کے لیے اس طرح ایک قطعہ زمین کے لیے بیس۲۰ لاکھ کی ادائیگی کی گئی ہے"۔

جواب میں ایک موٹے اور بڑی سی توند والے صاحب نے مسمسی صورت بنائی اور پھر ایک لمبی سانس کھینچ کر پہلے تو اپنے پیٹ میں ہوا بھری پھر ایک جھٹکے سے اس ہوا کو خارج کرتے ہوئے بولے "بچی کُھچی جو جگہ ہے ختم ہوتی جارہی ہے۔ دیکھیے گا کچھ دنوں میں جگہ کے لالے پڑ جائیں گے اور قبر کے لیے دو گز جگہ بھی نصیب نہیں ہوگی"۔

میں نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری بیوی مجھ سے مخاطب ہو "زندگی بھر کرائے کے مکانوں میں دھکے کھاتے رہیے گا یا بچوں کے مستقبل کے لیے بھی کچھ سوچ رہے ہیں اگر زمین نہیں خرید سکتے تو کوئی فلیٹ ہی قسطوں پر لے لیجیے کم از کم سر چھپانے کا ٹھکانا تو ہو جائے۔ مجھے احساس ہوا میری بیوی ٹھیک ہی کہتی ہے وہ واقعی دانشمند ہے میں تو اس کی باتوں کو خبط سمجھ کر ہمیشہ ٹال جایا کرتا تھا مجھے اب پتہ چلا کہ میں قطعی دھوکے میں تھا۔ اب تک میں یہی رونا روتا رہا ہوں کہ غریبی بڑھ رہی ہے مگر آج انکشاف ہوا غریبی نہیں بلکہ امیری بڑھ رہی ہے۔

میں اسی غور و خوض میں مبتلا تھا کہ دیکھا پانچ چھ آدمی ایک جنازے کو اُٹھائے لیے چلے آرہے ہیں۔ ہانپتے کانپتے پسینے میں شرابور آپس میں کاندھا تبدیل کرتے۔

اُن کو دیکھ کر ایک صاحب بولے معلوم ہوتا ہے کسی غریب کا جنازہ ہے، دوسرے صاحب طنزیہ مسکرائے معلوم کیا ہوتا ہے صاف پتہ چل رہا ہے بے چارے غریب ہی ہیں اُن کا حلیہ نہیں دیکھ رہے ہو؟

پھر ایک آواز اُبھری کیا غریبوں کے عزیز رشتے دار نہیں ہوتے..... ان کے رشتے دار تو ہوں گے وہ کیوں نہیں آئے۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے خود ہی بولے ہاں بھائی غریب کا کوئی نہیں ہوتا۔ کئی آوازیں بیک وقت آئیں ہاں صاحب بات تو سہی ہے۔ مزید ایک آواز اُبھری جنازے کو کاندھا دینا ثواب ہے۔ ہم لوگوں کو چاہیے چل کر کاندھا دیں یہاں کھڑے بیکار باتیں بنارہے ہیں۔ اس کے بعد لوگوں نے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھا اور سب خاموش ہو گئے۔ آنِ واحد میں وہاں قبرستان کی ماوراتی خاموشی چھا گئی۔

جب لوگوں نے بات چیت بند کر دی تو مجھے اکتاہٹ محسوس ہوئی۔ دفن میں ابھی دیر تھی کیوں کہ قبر کھودی جارہی تھی۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ سر جھکائے لوگوں کی باتوں پر غور کرتا ہوا میں چلا جا رہا تھا کہ میری سماعت سے ایک آواز ٹکرائی "صاحب...... میرے بچے کے کفن کے لیے کچھ دے دیجیے۔" میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ ایک بوڑھا مجھ سے مخاطب تھا۔

سامنے ہی روش کے کنارے ایک میلا کپڑا بچھا ہوا تھا اس کے اوپر ایک لڑکے کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ ارد گرد چند نوٹ بکھرے ہوئے تھے۔ ابھی میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ ایک گورکن اس بوڑھے کے قریب آیا اور اس سے مخاطب ہوا صبح سے دوپہر ہو گیا تم ابھی تک لاش لیے بیٹھا ہے۔ لاش پھول رہا ہے تم کب تک چندہ جمع کرے گا کیا بیٹے کو مٹی دینے کا کھیال نہیں ہے؟"

جواب میں اس بوڑھے نے گورکن کو بڑی بے چارگی سے دیکھا اس سے قبل کہ بوڑھا کچھ جواب دے گورکن دوبارہ بولا۔

"ارے پاگل اس کو زندگی میں تو نیا کپڑا ملا نہیں اب مرنے کے بعد اس کو

نیا کپڑا دینے کی کیا جرورت ہوگئی۔ آج گرمی بہت ہے لاش میں بُو آجائے گا جلدی جاکر جنازہ پڑھالے۔"

بوڑھے نے گورکن سے کچھ نہیں کہا مُسمسی سی صورت بناکر مجھے تکنے لگا۔

میں نے گھبراکر اپنی جیب ٹٹولی۔ دس ٹکے کا ایک نوٹ پڑا ہوا تھا جو میری واپسی کا کرایہ تھا۔ میں ابھی تذبذب میں ہی تھا کہ بوڑھے نے میرے آگے ہاتھ پھیلا دیا "صاحب"

وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ میں نے وہ نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور اس سے قبل کہ وہ کچھ اور کہے میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

دفعتاً مجھے خیال آیا کہ میں بلا مقصد چہل قدمی کر رہا ہوں اپنے استاد اور عالم وقت مولانا سلطان احمد کی قبر پر جاکر فاتحہ کیوں نہ پڑھ آؤں۔

یا حیرت مولانا کی قبر کہاں گئی۔ تمام نشانیاں کھوج ڈالیں۔ تلاش بسیار کے بعد بھی مجھے ان کی قبر نہیں ملی۔ آخر میں نے گورکن کو پکڑا اور اس سے پوچھا تو جواب ملا وہ جگہ کھود کر سب جمین برابر کر دی گئی ہے۔

میں نے سوال اُٹھایا بھائی کیوں ایسا کیوں کیا گیا؟ تو وہ میری سادگی پہ مسکرایا اور بولا آپ کو معلوم ہے ڈھاکہ کی آبادی کتنی ہے؟ اور کتنے لوگ یہاں روجانہ مرتے ہیں اگر کبریں نہ کھودی جائیں تو پورا ڈھاکہ کبرستان نہ بن جائے۔

اچانک میری نظر روش کے کنارے کھجور کے درخت کے پاس گئی جہاں ایک پختہ تُربت تیار ہو رہی تھی اُس پر دیدہ زیب ٹائل چڑھائے جا رہے تھے۔ میں نے گورکن سے پوچھا یہ کیسی قبر ہے اس پر ٹائل کیوں چڑھائے جا رہے ہیں؟ کیا صرف چار ماہ کے لیے؟

میرے اس سوال پر گورکن نے بے اختیار اپنے پیلے پیلے دانت نکال دیے اور مسکراتے ہوئے بولا "صاحب آپ بھی کیسا پاگل ہے ارے اس مجار کو بناتے بناتے پورا چھ مہینہ تو چلا گیا ادھر کی جمین جنرل نہیں ہے یہ جگہ بکری ہو چکا ہے۔"

او آئی سی یہ تو میں نے غور ہی نہیں کیا تھا اسپیشل لوگ اسپیشل زمین جنرل لوگ

جنرل معاملات ... یہ پیارے جنرل لوگ جو ہمیشہ جنرل وارڈ میں پیدا ہوتے ہیں پھر بیمار ہو کر کسی جنرل وارڈ میں داخل ہو جاتے ہیں اور مر کر جنرل زمین میں کھپ جاتے ہیں، مجھے لفظ جنرل کی وسعتوں پر پیار آنے لگا کہ گورکن کی آواز آئی کیا سوچنے لگا صاحب یہ شہر کے بہت بڑے لوگ کی بیگم کا مجار ہے الیاس بھائی مدھوریتا سینما والے ہیں نا یہ مجار انھوں نے اپنی بیگم کے لیے بنوایا ہے۔

میرے محبوب انھیں بھی تو محبت ہوگی — جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکل جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود — آج تک اُن پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گورکن ساحر کی نظم تاج محل گنگنا رہا ہے تو کیا..... تو کیا ساحر گورکنوں میں بھی مشہور ہے؟

میں نے گھبرا کر گورکن کو دیکھا وہ غریب تو گریبان کے اندر ہاتھ ڈالے اپنا جسم کھجلا رہا تھا۔ قبرستان کی مٹی اس کے جسم پر جگہ جگہ چپک کر خشک ہوگئی تھی وہ اُسے کھرچنے میں مصروف تھا۔

میں نے ادھر ادھر نظر ڈالی آس پاس اور بھی کئی پختہ قبریں موجود تھیں۔ کچھ پرانی کچھ نئی کچھ کا سیمنٹ کئی جگہ سے پھٹ گیا ہے اور درزوں میں سے خودرو پودے اُگ آئے ہیں۔ کچھ پر تازہ تازہ سفیدی پھیری گئی ہے۔ بڑی بڑی کوٹھیاں، صاف ستھرے بنگلے آبادی سے الگ تھلگ، قطار در قطار، شور نہ غوغا، سکون ہی سکون اور پھر شہر کے ہنگامے چیخ و پکار کچے پکے مکانات، بجلی سے محروم چھوٹے چھوٹے کمرے، گرمی، حبس چھنچھناتی گھڑگھڑاتی ریل گاڑیاں پٹری کے کنارے کنارے جھونپڑیاں .....

ابھی کل کی بات ہے ریلوے پٹی کی جھونپڑیوں کو خالی کرانے کے لیے پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔

ہنگامہ چیخ و پکار، آہ و بکا، مرد عورت، بچے بوڑھے، چیتھڑوں میں لپٹے نیم برہنہ اپنی اپنی گٹھریاں سنبھالے المونیم کے ٹیڑھے بگچے گملے لیے ادھر اُدھر بھاگ رہے ہیں بلڈوزر چلنے کا ارتعاش، مفلسی، بے بسی، بے کسی.....

بلڈوزر مسلسل چل رہا ہے قبریں اُکھاڑی جارہی ہیں۔ زمین ہموار ہورہی ہے
ادھ گلی ہڈیاں بکھری ہوئی ہیں۔ کچھ کھوپڑیاں دور اُس طرف کی پختہ تُربتوں کو تکتے ہوئے
اپنی قسمت پر نوحہ خواں..... میں ان ہی خیالات میں گم تھا کہ گورکن نے میرا شانہ پکڑ کر
ہلایا" جائیے صاحب وہاں آپ کے مُردے کو مٹی دیا جارہا ہے۔"

میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ وقت کتنی جلدی گزر گیا۔

اور جب سب مٹی دے چکے تو ایک آواز آئی "دُعائے مغفرت مانگ لیجیے۔"
میں نے بھی اپنے ہاتھ اُٹھادیے۔ سب لوگ مُردے کی مغفرت کے لیے دعا مانگ رہے
تھے اُن میں چھوٹے بھی تھے اور بڑے بھی ہاں شاید یہی وہ نقطۂ اتصال ہے جہاں
چھوٹے بڑے سب برابر دکھائی دے رہے تھے۔ سب بے بس، سب لاچار،
سب مجبور.......

عام طور پر وہ پگلی مشہور تھی۔ ننگے پاؤں پھٹے حالوں شوریدہ سر شہر کی سڑکوں کے چکر لگاتی رہتی۔ کبھی اِدھر تو کبھی اُدھر اس کے پاؤں میں چکر لگا ہوا تھا کسی ایک جگہ ٹک کر وہ بیٹھتی ہی نہ تھی۔

شاید وہ اس شہر کی باشندہ بھی نہ تھی، کیوں کہ فسادات کے بعد سے ہی وہ یہاں نظر آئی تھی۔ غالباً کسی آس پاس کے شہر کی ہوگی۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وہ ہمیشہ ایک چھری اپنی مٹھی میں دابے رہتی، کبھی کوئی کھلنڈرا پگلی سے چھری لینے کی کوشش کرتا تو وہ واویلا مچادیتی اور مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتی۔ علاوہ چھری کے اور کسی شے کی پرواہ نہیں تھی۔ ویسے وہ تھی قطعی بے ضرر، عموماً بچے اُسے گھیرے رہتے اور پگلی پگلی کہہ کر اس پر آوازے کستے لیکن وہ کبھی کسی کو کچھ نہ کہتی اور کہتی بھی کیا وہ تو خود بے زبان تھی بالکل گائے کی طرح معصوم۔ گائے بھی کبھی کبھار ہنکارہ بھر لیتی ہے لیکن پگلی کی تو آواز بھی آج تک کسی نے نہیں سُنی تھی۔

اس کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ شاید کسی حادثہ نے اس کی قوتِ گویائی سلب کر لی ہے۔

بچے اُسے چھیڑتے اور کبھی اس کی ساڑی کا پلو پکڑ کر اتنے زور سے کھینچتے کہ ساڑی چر سے پھٹ جاتی لیکن غصہ کرنا تو درکنار اس کی آنکھوں میں میل بھی نہ آتا بس وہ مُسکرا مُسکرا کر بچوں کو تکتی رہتی۔

ایک دن میرے سامنے ایک بچّے نے اس کے ڈھیلا کھینچ مارا۔ بگھلی کی پیشانی پھٹ گئی۔ خون رسنے لگا۔ سب بچّے ڈر کر بھاگ گئے اور وہ وہیں فٹ پاتھ پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ کچھ لوگ دوڑ پڑے۔ اضطراری طور پر میں بھی دوڑ کر بگھلی کے پاس پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ وہ خالی خالی نظروں سے سامنے سڑک کو تکے جا رہی ہے رو رہی ہے اور نہ اُس کے چہرے سے کسی قسم کی تکلیف کا اظہار ہو رہا ہے۔ ایسے موقع پر اچھے بھلے آدمی کے چہرے پہ بھی کرب کے آثار دکھائی دینے لگتے ہیں۔ چہ جائیکہ پاگل وہ تو واویلا مچا دیتے ہیں۔

بگھلی کو خاموش دیکھ کر مجھے بہت کوفت ہو رہی تھی کیوں کہ آج تک میں نے اس کی آواز سُنی ہی نہ تھی اور آج میرا خیال تھا کہ میں ضرور اس کی آواز سُن سکوں گا خواہ وہ رونے دھونے کی ہی کیوں نہ ہو۔

میرے اندر نہ جانے کون سا احساس چھُپا بیٹھا ہے کہ میں جب بھی کسی اجنبی کو دیکھتا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کی آواز بھی سُن لوں۔ اگر وہ اجنبی گفتگو میں تاخیر کرے تو مجھے الجھن ہونے لگتی ہے اور خود بخود میرے ذہن میں طرح طرح کے چھوٹے بڑے سوالیہ نشانات گردش کرنے لگتے ہیں۔ اس شخص کی آواز کیسی ہو گی موٹی یا مہین، بھاری ہو گی یا سُریلی اور جب تک وہ شخص کچھ بولتا نہیں میں بے چین رہتا ہوں۔ اگر کسی محفل میں کچھ لوگ گفتگو کر رہے ہوں اور وہاں کوئی اجنبی خاموش رہے تو میں عجیب طرح کے کرب میں مبتلا ہو جاتا ہوں اور مجھے تب تک چین نہیں پڑتا جب تک میں اُس کی آواز نہ سُن لوں۔ اور پھر میرا دھندہ بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ مجھے ہر دم.... اجنبیوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ دراصل میں ایک چھوٹے سے اخبار کا رپورٹر ہوں دن بھر شہر میں گھوم گھوم کر چٹپٹی خبریں اور واقعات جمع کرتا رہتا ہوں۔

لیکن بگھلی سے تو کسی خبر کی وابستگی کی اُمید بھی نہیں ہے پھر بھی میں کبھی کبھی اس کے پیچھے چل پڑتا ہوں اس کی وجہ شاید میرا یہی احساس ہے کہ میں اس کی آواز سننا چاہتا ہوں اور آج بھی میں اسی چکر میں تھا۔ بگھلی کی پیشانی سے خون نکلتا دیکھ کر اس کے گرد

لوگ جمع ہو گئے تھے۔ کچھ دیر تک تو میں اس کے رونے کی آواز کا منتظر رہا پھر اکتا کر وہاں سے چلا آیا۔

میں وہاں سے چلا تو آیا تھا لیکن میری سوچ کا محور پگلی ہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس بیچاری کو پگلی کا خطاب کیوں دیا گیا۔ یہ پاگل تو نہیں لگتی کسی کو مارتی ہے نہ کاٹتی ہے چیختی ہے نہ چلاتی ہے۔ اور نہ ہی اس کی آنکھوں میں وحشت ہے۔ اس کی آنکھیں تو تھکی تھکی اور نڈھال سی معلوم پڑتی ہے جیسے منوں غم کا بوجھ سہ رہی ہوں۔ البتہ بچوں کو دیکھ کر وہ جب مسکراتی تو اس کی آنکھوں میں چراغ جلتے نظر آتے۔ اس کی کوئی ایسی زیادہ عمر بھی نہیں تھی۔ بس تیس بتیس کے قریب ہوگی۔ کبھی کسی سے وہ کچھ مانگتی نہیں تھی کوئی کچھ کھانے کو دے دے تو کھا لیتی ورنہ خاموشی سے ادھر سے اُدھر ٹہلتی رہتی۔

عموماً اس کے گرد سٹے بازوں کا جمگھٹ لگا رہتا اور کبھی کبھی کچھ ضعیف الاعتقاد عورتیں بھی اس کے پاس فٹ پاتھ پر بیٹھی نظر آتیں۔ یہ اپنی منت مرادوں کے چکر میں پگلی کی خاطر کیا کرتیں۔ سٹے باز اپنے نمبروں کے پھیر میں اس کی مدارات کرتے نظر آتے اور وہ بیچاری بڑے سکون سے ہر ایک کی دلی آرزو سنتی۔ وہ تو بے زبان تھی بھلا انھیں وہ کیا دعائیں دیتی اور کیا نمبر بتلاتی۔ جب بیٹھے بیٹھے وہ تھک جاتی اور پہلو بدلتی تو اس کے ہاتھ پاؤں اِدھر اُدھر جنبش کرتے تب حاجت منداس کے ہاتھ پیروں کی حرکت سے ہی کوئی نہ کوئی نتیجہ برآمد کر لیتے جیسے کوئی بقراطی تجریدی آرٹ کی الجھی ہوئی لکیروں سے نتیجہ برآمد کر لیتا ہے۔ حاجت منداس کی حرکات و سکنات پر گہری نظر رکھتے۔ اگر اس نے اپنی پلکیں چھ بار جھپکائی ہیں تو چھ کا نمبر پکا سمجھا جاتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ نمبر بارہ کا کھل جاتے تو وہ تب بھی ان کے یقین کو متزلزل نہیں کرتا وہ یہی سوچ لیتے غلطی تو ہماری ہے اس نے تو اپنی دونوں آنکھوں کی پلکوں کو چھ مرتبہ جھپکایا تھا اس حساب سے چھ دونی بارہ ہوتے یا پھر پگلی نے انھیں تکتے تکتے اپنے دیدوں کو حرکت دی تو بھی اشارہ مل جاتا کہ دیدے دائیں سے بائیں کتنی بار گھومے۔ یار لوگ تو یہاں تک خیال رکھتے کہ مدعا سنتے وقت وہ مسکرائی تو نہیں ہے، اور اگر مسکرائی ہے تو اس نے اپنے کتنے دانتوں کی نمائش کی ہے۔

بظاہر پگلی کو کسی قسم کی تکلیف نہ تھی میری مراد روٹی کپڑے اور مکان سے ہے۔ مکان کی قید سے وہ ذہنی طور پر آزاد تھی۔ رہا روٹی کپڑا تو اس کے چاہنے والے وہ سب کچھ اس کو وافر مقدار میں پہنچاتے رہتے تھے۔

پگلی کو دیکھ کر دل قدرت کے نظام کا قائل ہو جاتا۔ واقعی وہ بہت بڑا ناظم ہے میرے ذہن میں ایک سوال اور اُبھرتا ہے جب پاگلوں کی وہ اتنی خبر گیری کرتا ہے تو ہم عقل والوں کو اس نے کھلا کیوں چھوڑ دیا ہے جو بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ سرپٹ ایک دوسرے کے پیچھے محض آگے نکل جانے کے خیال سے۔ پاگل کون ہے ہم اور آپ؟ جو ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی جدوجہد تیز سے تیز تر کیے ہوتے ہیں یا وہ حاجت مند جو اپنی مرادیں اور سٹے کا نمبر ایک پگلی کے اشاروں کنایوں سے اخذ کرتے ہیں یا پھر وہ نیم دیوانی گونگی عورت جو پاگل نہ ہو کر بھی ہماری نظروں میں پاگل ہے۔

ایک دن میں اپنے آفس میں کام کر رہا تھا کہ باہر سے میرا چپراسی آیا اور بولا —

"صاحب پگلی پاگل ہو گئی ہے۔" میں نے فائلوں پر جھکا ہوا اپنا سر اونچا کیا اور اپنا چشمہ قدرے نیچے سرکا کر فریم کے باہر سے اُسے استفہامیہ نظروں سے دیکھا تو وہ گڑبڑا گیا اور قدرے توقف کے بعد وضاحتی انداز میں بولا "میرا مطلب ہے کہ وہ پگلی جو سڑکوں پر اِدھر اُدھر ٹہلتی رہتی ہے اس کی چھڑی کسی نے چرا لی ہے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔ جب ایک شخص نے اُسے چپ کرانے کی کوشش کی تو وہ اور بھی بھڑک گئی اس نے اس شخص کو پتھر کھینچ مارا اور غصہ میں اس کے ہاتھ جو بھی لگا وہ پھینک پھینک کر مارنے لگی۔ ایک دکان کے شیشے بھی ٹوٹ گئے۔ صاحب اس کو جنون چڑھ گیا ہے۔"

میں نے بیساختہ پوچھا "وہ ہے کہاں؟"

"فراش گنج کی گلی کے پاس سامنے والے فٹ پاتھ پہ بیٹھی رو رہی ہے۔"

میں تڑپ کر کھڑا ہو گیا اور چپراسی سے یہ کہتا ہوا کہ تم ان فائلوں کو بند کر دو میں ابھی آتا ہوں — لمبے لمبے قدم بڑھاتا فراش گنج کی جانب بڑھ گیا۔

وہاں پہنچا تو ایک مجمع فٹ پاتھ پر جمع تھا۔ لوگ اُچک اُچک کر بھیڑ کے اندر جھانکنے

کی کوشش کر رہے تھے۔ میں بھیڑ کو چیرتا ہوا کسی نہ کسی طرح بگلی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہلکی ہلکی سسکیاں اُس کے منہ سے نکل رہی تھیں۔ کئی سٹے باز اس کے نزدیک بیٹھے اس کو چپ کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں جو کہ اُس کی آواز سننے کے لیے بے چین تھا۔ دل ہی دل میں اُن سٹے بازوں پر بہت جھنجلایا کہ یہ کمبخت اسے چپ کرانے کی کوشش ناگہاں کر رہے ہیں اگر یہ خاموش ہو گئی تو میرے ہاتھ سے یہ موقع بھی نکل جائے گا اور میں آج بھی اس کی آواز نہ سُن سکوں گا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ بگلی سے کس طرح بات کروں کہ میری سماعت سے ایک بھاری آواز ٹکرائی ہو" ہٹو راستہ دو" پھر فوراً ہی لوگوں میں کانا پھوسی شروع ہو گئی..... "جھریا آ گیا.... جھریا آ گیا..."

جھریا یہاں کا مشہور غنڈہ ہے۔ اس علاقے میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے کہاں جاتا ہے اس کی پہنچ بہت اوپر تک ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ کائی کی طرح پھٹنا شروع ہو گئی..... بھیڑ کو کاٹتا ہوا ایک قد آور اور مضبوط جسم والا شخص نظر آیا یہی جھریا تھا جھریا کو جب یہ معلوم ہوا کہ بگلی کی چھری کسی نے چرا لی ہے وہ اس وجہ سے رو رہی ہے تو وہ بہت زور سے ہنسا اور بولا۔

"ارے بگلی تجھے چھری کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

پھر اُس نے نیفے میں اڑسا ہوا ایک چاقو باہر نکالا اور اسے بگلی کے سامنے کر کے بٹن دبا دیا چاقو کا پانچ انچی پھل بگلی کے سامنے جوں ہی چمکا وہ وحشیانہ انداز میں چاقو پر جھپٹی اور جھریا نے ہاتھ پیچھے کر کے چاقو بند کیا اور بگلی کی جانب بڑھا دیا۔ اب بگلی نے اپنا بڑھا ہوا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور منہ بسور بسور کر اُسے گھورنے لگی۔ جھریا نے دریافت کیا "کیوں کیا ہوا؟ چاقو نہیں لے گی؟" تو جواب میں بگلی نے ایک بھیانک چیخ کے ساتھ رونا شروع کر دیا۔

جھریا ہنس پڑا اور بولا "کھلا ہوا چاقو لے گی لے پکڑ، میرا کیا ہے دیکھ ہاتھ پیر نہ کاٹ لینا!"

یہ کہہ کر اس نے چاقو کا بٹن دوبارہ دبا دیا پھل ایک بار پھر ایستادہ ہو گیا۔ بگلی

نے جیسے ہی کھلا ہوا چاقو دیکھا اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر چاقو جھریا سے جھپٹ لیا اور مشکور نگاہوں سے جھریا کو تکنے لگی۔

اُس نے کچھ دیر تک تو اُس چاقو کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر اپنی گدڑی میں سے ایک چیتھڑا نکال کر چاقو کو اس میں لپیٹا اور اپنی بغل میں دبا لیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر خالی خالی نظروں سے اِدھر اُدھر تکنے لگی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو بھیڑ آہستہ آہستہ چھٹنے لگی۔ میں بھی وہاں سے چلا آیا۔

اس واقعہ کے بعد میری مصروفیت بڑھ گئی تھی اور میں پگلی کو بھول سا گیا تھا ملک کی سیاسی فضا خراب ہوتی جا رہی تھی۔ دو فرقوں کے درمیان تناؤ بڑھتا جا رہا تھا پھر ایک دن شہر میں فساد بھی پھوٹ پڑا۔ سرکار کو کرفیو کا سہارا لینا پڑا۔

میں چونکہ اپنے اخبار کا اکلوتا رپورٹر ہوں لہٰذا شہر میں گھومنے اور خبریں جمع کرنے کے لیے میں نے کرفیو پاس لیا اور موٹر سائیکل پر شہر کے چکر لگانے لگا۔

آج کرفیو کو تیسرا روز تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ رات کی سیاہی دھیرے دھیرے پھیلتی جا رہی تھی۔ سڑکوں پر سناٹا تھا۔ پولیس کی گاڑیاں ویران سڑکوں پر دندناتی پھر رہی تھیں۔ میں ریلوے اسٹیشن کی جانب سے اندرونِ شہر جا رہا تھا کہ ایک جگہ مجھے کچھ لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ کرفیو میں ہجوم دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی۔ میں نے اپنی بائک تیزی سے آگے بڑھائی۔ قریب جا کر معلوم ہوا یہ غنڈوں کا غول تھا جو لوٹ کا مال اُٹھائے لیے جا رہے تھے۔ پولیس نے انھیں روک رکھا تھا وہ بتلا رہے تھے کہ وہ سب جھریا کے آدمی ہیں لہٰذا انھیں چھوڑ دیا جائے۔ ابھی تکرار جاری تھی کہ سناٹے کو چیرتی ہوئی ایک دلدوز چیخ اُبھری "بچاؤ۔ بچاؤ" یہ کسی لڑکی کی چیخ تھی جو سامنے والی گلی میں سے آئی تھی۔ چیخ کی آواز سن کر وہ لوگ اپنی تکرار بھول گئے اور دم بخود ہو کر گلی کی جانب تکنے لگے۔ کچھ ہی لمحوں بعد جگر خراش چیخیں پھر بلند ہوئیں اور ان کا سلسلہ بڑھتا ہی گیا پھر ایسا معلوم ہوا جیسے وہ چیخیں ہم سے قریب ہوتی جا رہی ہیں۔ ماحول پر گمبھیر تا چھا گئی سب گلی کی جانب متوجہ ہو گئے کہ سامنے سے جھریا نمودار ہوا۔ اس نے اپنے کاندھے

پر ایک لڑکی کو اُٹھا رکھا تھا۔ وہ لڑکی اس کے کاندھے پر پڑی مچل رہی تھی اور بے بسی سے چیخیں مار رہی تھی۔ اچانک اسی جانب جدھر سے جھریا آیا تھا آندھی طوفان کی طرح بھاگتی ہوئی بگلی آئی اس کی آنکھیں وحشت سے سُرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنی مُٹھی میں پانچ انچی پھل والا کھُلا ہوا چاقو جکڑ رکھا تھا۔

پھر شاید نا...... قسم کی چیخ نما وہ آواز بگلی کے منہ سے ہی نکلی تھی کہ جھریا ٹھٹک کر گھوما۔ چشم زدن میں بگلی جھریا کے مقابل پہنچ چکی تھی۔ جب تک جھریا معاملے کو سمجھے ایک دو تین کھچا کھچ چاقو کا چمکدار پھل جھریا کے پیٹ کو کئی جگہ سے چیر چکا تھا۔ مچلتی ہوئی لڑکی جھریا کے کاندھے سے گر گئی اور خود جھریا کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ بگلی شیرنی کی طرح اُس کے سینے پہ سوار ہو گئی اور جب تک پولیس مداخلت کرے وہ جھریا کا سر تن سے جُدا کر چکی تھی۔